Rev Canon Edward Sell

# The historical development of the Quran

# کشف القرآن

علامہ ڈاکٹر ایڈورڈ سیل صاحب

ترجمہ منشی محمد اسماعیل

1902

# THE HISTORICAL DEVELOPMENT OF THE QURAN

BY

THE REV. CANON SELL, D.D., M.R.A.S.

AUTHOR OF 'THE FAITH OF ISLAM,' 'THE RELIGIOUS ORDERS OF ISLAM,"THE LIFE OF MUHAMMAD,' 'ISLAM: ITS RISE AND PROGRESS'

# کشف القرآن

یعنی

# قرآن کی تواریخی ترتیب کا اظہار

من تصنیف

ڈاکٹر ایڈورڈ سیل صاحب۔ایم۔آر۔اے۔ایس

جس کو

ڈاکٹر ای۔ایم۔ویری صاحب کے اہتمام سے منشی محمد اسمٰعیل

نے انگریزی زبان سے ترجمہ کیا

۱۹۰۲

# REV. CANON EDWARD SELL, D.D., M.R.A.S.

24 January 1839 – 15 February 1932

He was an Anglican orientalist, writer and missionary in India.

# فہرست مضامین


| | مضمون |
|---|---|
| ۱ | التماس مترجم |
| ۲ | دیباچہ مصنف |
| | **باب اوّل** |
| | **ایامِ مکہ** |
| ۱ | الہامِ اوّل اور قریش کی لاپرواہی |
| ۲ | مسلمانوں کی مظلومانہ حالت اور مخالفین سے عتاب |
| ۳ | وحی کا بیان اور معجزات کی نفی |
| ۴ | قریش کی پس وپیش اور شک کی حالت |
| ۵ | بہشت کی خوشیاں اور خدیجہ کا رعب |
| ۶ | دوزخ کا بیان۔ آنحضرت بحیثیت نذیر اور اے بی سنیا کی طرف ہجرت |
| ۷ | لات وعزیٰ اور بُت پرستی کا استیصال |
| ۸ | قریش کی ردوکد ااور انبیاء سلف کی مخالفت |
| ۹ | قریش کو لعنت ملامت |
| ۱۰ | دعویٰ الہام وانکار از جعلسازی |
| ۱۱ | قرآن عدیم المثال اور بے نظیر |
| ۱۲ | یہود ونصاریٰ اور صائبین کا بیان۔ یہودیوں سے رشتہ |
| ۱۳ | پرانی کہانیاں۔ طائف کا دورہ |
| ۱۴ | مدنی مسافر۔ ساکنان مدینہ |
| ۱۵ | عقبہ کا عہد اوّل اور معراج |
| ۱۶ | عقبہ کا عہد دوم۔ مدینہ کی طرف ہجرت |
| ۱۷ | مدنی منظر |

| | مضمون |
|---|---|
| | **بابِ دوم** |
| | **ایامِ مدینہ** |
| ۱ | آنحضرت ﷺ کا مدینہ میں داخل ہونا |
| ۲ | اہلِ یہود اور ان کی مخالفت اور ان پر الزام |
| ۳ | صرف اسلام حقیقی دین۔ اہل یہود پر ریاکاری اور تحریف و تخریب کلام اللہ کا الزام۔ بائبل کی فرمانبرداری کا حکم۔ قرآن کُتب مقدسہ کا محافظ۔ قبلہ کی تبدیلی اور یہود سے کنارہ کشی |
| ۴ | حج کی اجازت۔ یہودیوں کو ستانا اور قتل کرنا۔ جنگی مہامت اور جنگِ بدر اور آنحضرت ﷺ کی فتح یابی |
| ۵ | جنگِ احد اور آنحضرت ﷺ کی شکست |
| ۶ | آنحضرت ﷺ کی اُمیدیں۔ زینب اور زید۔ آنحضرت کی منکوحہ بیویاں اور حرم۔ مدینہ کا محاصرہ |
| ۷ | حج کا آرزو اور عہد حدیبیہ |
| ۸ | اسلام کے خاص حقوق۔ عمرہ یا حج صغرا۔ جنگ متہ۔ فتح مکہ۔ محاصرہ۔ طائف۔ سال رسالت یا وکالت۔ تبوک پر لشکر کشی۔ یہود و نصاریٰ پر جبر و اکرہ |
| ۹ | جوازِ جبر اور آنحضرت کا نعرہ جنگ |
| ۱۰ | ریاکاروں اور عربوں کی سرزنش۔ ابو بکر اور حج۔ اہل عرب سے عہد و پیمان اور آنحضرت ﷺ کی مطلق العنانی |
| ۱۱ | حج اکبر اور اس کی تاثیرات |
| ۱۲ | خُدا اور اس کا رسول۔ مدنی سورتوں کا طرز بیان۔ تواریخی ترتیب کی ضرورت اور طرز بیان میں تبدیلی |

# التماس مترجم

کشفِ القرآن یعنی سیل صاحب کی کتاب Historical Development of the Quran کا اردو ترجمہ ہدیہ ناظرین کرتے وقت اس قدر عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس ترجمہ میں مصنف کے خیالات اور دلائل کو حتی المقدور (جہاں تک ہو سکے) بغیر کسی طرح کی کمی بیشی کے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور طرز بیان بھی ایسا اختیار کیا گیا ہے۔ جو ناظرین کو مرغوب (پسندیدہ) ہو اور مصنف کے مدعا و مقصود کو بالتوضیح ظاہر کرے۔ بعض امور میں یہ ترجمہ انگریزی اصل پر فوق (فوقیت) رکھتا ہے۔ مثلاً جس قدر آیاتِ قرآنی اقتباس کی گئی ہیں وہ سب کی سب حرف بحرف اصل قرآنی عربی میں پیش گئی ہیں۔ اور ان کے ذیل عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ دہلوی کا اردو ترجمہ مندرج ہے۔ علاوہ بریں تمام مقتبسات کے حوالجات میں وہی طریق اختیار کیا گیا ہے۔ جو علمائے اسلام میں رائج ہے اور جس کو بآسانی اور بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

مصنف کا طرز بیان قابل تعریف ہے۔ وہ اپنے بیان و براہین کو پیش کرتے وقت نہایت ہمدرد اور منصف مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مرام و مقصد اور اصلی مطلوب سوائے اظہار حق اور کچھ قصور نہیں ہوتا۔ مترجم نے بھی حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اس ترجمہ کا مفہوم بتمامہ وہی ہو جو انگریزی اصل میں متضمن (شامل کیا ہوا) ہے۔ خُدائے تعالیٰ اس ترجمہ کے مطالعہ پر برکت بخشے اور اس کو فی الحقیقت کشف القرآن بنادے۔ آمین۔

# دیباچہ مصنف

اس کتاب سے آنحضرت ﷺ کے سوانح عمری اور ان کی زندگی کے تمام واقعات مراد نہیں ہیں۔ بلکہ یہ قرآن کے متدارج انکشاف کی تواریخ ہے۔ جس سے اس امر کی توضیح (وضاحت) ہوتی ہے کہ قرآن نے کس طرح بتدریج موجودہ صورت اختیار کی اور کہاں تک آنحضرت کی اپنی ہی زندگی کے واقعات اس کی بیخ و بن (جڑ۔بنیاد) ثابت ہوتے ہیں۔ اس پہلو سے قرآن پر نظر کی جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جن اقوام سے اسے سابقہ پڑا ان کے حق میں کس قدر حسب ضرورت رخ بدلتا رہا ہے۔ اس کے احکام کی مناسبت اس کے عذرات اور زجر و عتاب (غصّہ۔ڈانٹ ڈپٹ) وغیرہ پر غور کرنے سے ہم صاف نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کس نادر طور سے اسلام کی ضروریات کے مطابق قرآن کے مختصر الہامی فقرے نازل ہوتے رہے۔

قرآن کی سورتوں کے نزول کی تاریخ ان کی ترتیب میں نے وہی اختیار کی ہے جو نولدیکی صاحب کی کتاب مسمی بہ گشیختی دس قرآن میں پائی جاتی ہے۔ میری رائے میں یہ تواریخی ترتیب نہایت ہی قابلِ اعتبار اور قرین صحت ہے۔ فہرست ذیل سے معلوم ہو جائے گا کہ نولدیکی صاحب تمام مکی سورتوں کو تین حصّوں میں منقسم کرتے ہیں یعنی ابتدائی۔ وسطی اور زمانہ بعد کی سورتیں۔ اور باقی سورتوں کو سلسلہ چہارم قرار دیتے ہیں۔

# مکی سورتیں

## سلسلہ اوّل

آنحضرت ﷺ کی بعثت (رسالت) کے پہلے پانچ سال یعنی ۶۱۲ء سے ۶۱۷ء تک کی مکی سورتیں بترتیب ذیل ہیں:

(۱)علق،(۲)مدثر ،(۳)لہب ،(۴)قریش،(۵)کوثر ،(۶)ہمزہ،(۷)ماعون،(۸)تکاثر ،(۹)فیل، (۱۰)لیل ،(۱۱)،بلد (۱۲)انشراح ،(۱۳)ضحیٰ،(۱۴)قدر ،(۱۵)طارق (۱۶)شمس ،(۱۷) عبس ،(۱۸)قلم ،(۱۹)اعلیٰ،(۲۰)تین،(۲۱)عصر ،(۲۲)بروج،(۲۳)مزمل ،(۲۴)قارعہ، (۲۵)زلزال ،(۲۶)انفطار ،(۲۷)تکویر ،(۲۸)نجم (۲۹)انشقاق ،(۳۰)عادیات ،(۳۱) نازعات ،(۳۲)مرسلات ،(۳۳)نباء،(۳۴)غاشیہ،(۳۵)فجر،(۳۶)قیامت،(۳۷)تطفیف،

(۳۸)حاقہ،(۳۹)ذریت ،(۴۰)طور،(۴۱)واقعہ ،(۴۲)معارج،(۴۳)رحمن ،(۴۴)اخلاص ،(۴۵)کافرون،(۴۶)فلق ،(۴۷)ناس ،(۴۸) فاتحہ۔

## سلسلہ دوم

آنحضرت ﷺ کی بعثت کے پانچویں اور چھٹے سال یعنی ۶۱۷ء سے ۶۱۸ء تک کی مکی سورتیں بترتیب ذیل ہیں:

(۴۹)قمر،(۵۰)صفت ،(۵۱)نوح ،(۵۲)دھر ،(۵۳)دخان،(۵۴)ق ،(۵۵)،طٰہٰ،(۵۶)شعرا(۵۷)حجر،(۵۸)مریم،(۵۹)ص ،(۶۰)یس ،(۶۱)زخرف،(۶۲)جن(۶۳)ملک،(۶۴)مومنون،(۶۵)انبیاء،(۶۶)فرقان،(۶۷)بنی اسرائیل،(۶۸)نمل،(۶۹)کہف۔

## سلسلہ سوم

آنحضرت کی بعثت کے ساتویں سال سے ہجرت کے زمانہ تک یعنی 619ء سے 622ء تک کی مکی سورتیں بترتیب ذیل ہیں:

(۷۰)سجدہ،(۷۱) فصلت ،(۷۲) جاثیہ ،(۷۳) نحل ، (۷۴)روم ،(۷۵)ہود ،(۷۶)،ابراہیم (۷۷)یوسف ،(۷۸)مومن ،(۷۹)قصص،(۸۰)زمر ،(۸۱) عنکبوت(۸۲)لقمان،(۸۳)شوریٰ،(۸۴)یونس،(۸۵)سبا،(۸۶)فاطر،(۸۷)اعراف،(۸۸)احقاف،(۸۹) انعام،(۹۰)رعد۔

# سلسلہ چہارم

## مدنی سورتیں

زمانہ ہجرت سے آخر تک یعنی ۶۲۲ء سے ۶۳۲ء تک کی مدنی سورتوں کی ترتیب حسب ذیل ہے:

(۹۱)بقر (۹۲)بینہ ،(۹۳)تغابن،(۹۴)جمعہ ،(۹۵)انفال،(۹۶)محمد،(۹۷)آل عمران،(۹۸)صف،(۹۹)حدید،(۱۰۰)نساء(۱۰۱)طلاق، (۱۰۲)حشر (۱۰۳)احزاب، (۱۰۴)منفقون،(۱۰۵)نور ،(۱۰۶) مجادلہ ،(۱۰۷)حج ،(۱۰۸)فتح ،(۱۰۹)تحریم ،(۱۱۰) ممتحنہ ،(۱۱۱) نصر ، (۱۱۲) حجرات،(۱۱۳)توبہ (۱۱۴)مائدہ۔

آیات قرآنی کے اقتباس کرنے میں میں نے راڈویل صاحب اور پامر صاحب کے ترجموں کا استعمال کیا ہے۔اور بعض مقامات پر سیل صاحب اور لین صاحب کے ترجموں سے مدد لی ہے۔ نیز میں نے حسین اور شاہ ولی اللہ محدث کے فارسی ترجمہ اور عبدالقادر کے اردو ترجمہ اور خلاصتہ التفاسیر سے ان ترجموں کا مقابلہ کر کے دیکھا اور علاوہ بریں بہت سی تفاسیر کو دیکھ کر ان پر غور و فکر کرنے کے بعد مندرجہ کتاب ہذا کو صحیح قرار دیا ہے۔ان تفاسیر میں زیادہ تر الفاظ و فقرات کے مختلف معانی کی توضیح و تشریح کا بیان مندرج ہے اور ان سے قرآن کی قراءتِ مختلفہ وقتِ نزول اور اجزائے مرکبہ کی کچھ بہت صاف تشریح نہیں ہوتی حالانکہ علمائے اسلام میں نکتہ چینی اور چھان بین کی روح ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ان کی تفاسیر اور تحقیقات کا دار و مدار بجائے ادلہ عقلیہ کے صرف روایات پر ہے۔

# کشف القرآن

## باب اوّل

### ایام مکہ

آنحضرت ﷺ کے حالاتِ زندگی کی تفہیم نامہ (سمجھانا) کے لئے نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کے تمام تواریخی واقعات کا قرآن کے ان حصص سے جن سے وہ علاقہ (تعلق) رکھتے ہیں اچھی طرح مقابلہ کیا جائے۔ اس مقابلہ سے یہ مراد بوجہ اتم منکشف (ظاہر) ہو جائیگا کہ قرآن نے کس طرح بتدریج زور پکڑا۔ کس نادر (نایاب) طور پر الہامات و مکاشفات نے حسبِ موقعہ موجودہ حالات سے تطابق (مشابہت، مناسبت) کھایا اور آنحضرت ﷺ کے افعال و اقوال متناقضہ (برعکس، خلاف) کو سہارا دیکر اذن الہیٰ کی طرف منسوب کیا۔

سوائے اس متذکرہ بالا طریقہ کے اور کوئی صورت نظر نہیں آتی جس سے آنحضرت کی متبدل (تبدیل کرنے والی) حکمتِ عملی پر حرف نہ آئے اور خود بدولت بھی زمانہ سازی اور خلاف بیانی و مغائرت (اجنبیت۔ بے گانگی) کے الزام سے محفوظ رہیں۔

قرآن کے ابواب یا سورتوں کی ترتیب از روئے تواریخ بالکل غیر حقیقی ہے طول طویل (بہت لمبی) سورتیں کتاب کے شروع میں درج کی گئی ہیں اور یہ موجودہ ترتیب ایسی غلط ہے کہ قرآن کو اوّل سے آخر تک پڑھنے سے بھی پڑھنے والے پر محمد صاحب کی زندگی اور ان کے افعال و کردار کا حال منکشف (ظاہر) نہیں ہوتا بلکہ بدستور سابق بالکل مکنون و مکتوم (پوشیدہ و چُھپا ہوا) اور سربمہر (بند) رہتا ہے اور محض پریشانی و گھبراہٹ حاصل ہوتی ہے۔

عربی اور فارسی مفسرین نے مختلف طور پر سورتوں کو مرتب کیا ہے اور علاوہ ازیں میور اور نولدیکی صاحب نے بھی کوشش کی ہے۔ کہ قرآن کی ترتیب و تواریخی ترتیب ہو۔ چند سورتوں کے ٹھیک وقت نزول کے باب میں بہت اختلاف ہے اور بعض سورتوں کے چند حصص فی الحقیقت پورے مرکبات (کئی چیزوں کو ملانا) میں سے معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی ان کی چند آیات کا نازل ہونا مکہ میں بیان کیا جاتا ہے اور باقی کا مدینہ میں۔ لیکن اب ہم تمام عملی ضرورتوں کے لئے ان کو ایسی ترتیب میں مرتب کر سکتے ہیں جو حسبِ نزول (نازل ہونا) ہو۔

صفحات ذیل میں ظاہر کیا جائیگا کہ جب تمام سورتوں کو ان کی اصلی اور حقیقی تواریخی ترتیب سے مرتب کیا جائے تو کس قدر صفائی اور صراحت (وضاحت) سے رسول عربی کی تعلیم اور کارروائی کے سارے معمے (الجھا ہوا مسئلہ) صاف کھل جاتے ہیں۔ قرآن کے پہلے الفاظ وہ ہیں جو کہ حضرت نے غارِ حرا میں سنے اور اب سورہ علق میں مندرج ہیں کہ پڑھ [1] اپنے رب کے نام سے جس نے بنایا آدمی لہو کی پھٹکی سے۔

بعض کا خیال ہے کہ آنحضرت ﷺ کو وعظ کرنے کا پہلا حکم سورہ شعرا کے گیارھویں رکوع میں ہوا **انذر عشیرتک الاقربین**۔ یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کر۔ یہ الہام اوّل ہے جس کی منادی کا حکم ہوا لیکن اس پر یہ اعتراض ہے کہ مابعد کی آیات میں لکھا ہے کہ **وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ** یعنی ایمانداروں کے لئے شفقت سے اپنے بازوؤں کو جھکا پھر یہ الفاظ کہ **الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ** یعنی جب تو عبادت کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے تو کون تجھ کو دیکھتا ہے (سورہ شعرا آیت ۲۱۸، ۲۱۹) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی مسلمانوں کی ایک چھوٹی سے جماعت موجود تھی علاوہ ازیں اس سورۃ کا طرز بیان بھی ابتدائی نہیں کیونکہ العزیز الرحیم اور السمیع العلیم وغیرہ جملے صرف آخری سورتوں میں پائے جاتے ہیں [2]۔

پھر وہ زمانہ آیا جس کو فاطر کہتے ہیں جس میں کچھ نازل نہیں ہوا اور یہ زمانہ تین سال کا بیان کیا گیا ہے۔ اس عرصہ میں حضرت کی حالت نہایت تذبذب (شک و شبہ) کی تھی اور دل میں اپنی رسالت کی نسبت بہت سے شکوک (شک کی جمع) پیدا ہو گئے تھے۔ قبیلہ قریش نے جو مکہ میں نہایت زبردست قوم تھی اور جس سے آنحضرت کو فخر نسب تھا اس وقت کسی طرح کی ظاہرا مخالفت نہیں کی بلکہ وہ حضرت کو دیوانہ سمجھتے رہے کیونکہ مشرقی ممالک میں الہام والقا و دیوانگی و جنون کا ایک جزو خیال کیا جاتا تھا۔

پس جب تک آنحضرت عام طور پر وعظ و نصیحت کرتے اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ترغیب و تحریص (خواہش و لالچ) دلاتے اور قیامت کا ذکر اذکار کرتے رہے تب تک تو اہلِ قریش ان کو صرف بے پروائی اور نظر حقارت (نفرت کی نظر) سے دیکھتے رہے۔ لیکن جب آپ نے کعبہ کی بُت پرستی پر کھلم کھلا حملے شروع کئے اور ان کی توہین و تردید (رد کرنا) کرنی شروع کی تو معاملہ بالکل معکوس (اُلٹا) ہو گیا اور سخت مخالفت شروع ہو گئی۔ اس مخالفت کا خاص سبب یہ تھا کہ اہلِ مکہ کو اپنے قدیمی رسم و رواج کا بدلنا از حد ناگوار تھا [3]۔ یہ لوگ اس مذہب کو جس کے باعث شہر مکہ کو اہلِ عرب کے لئے ایک نہایت مقدس مقام خیال کیا جاتا تھا بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کا از حد پاس و ادب انہیں ملحوظ (خیال کیا گیا) رہتا تھا۔ اب تک ان کو مطلق

---

[1] **اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ**۔ لفظ اقراء کے استعمال کے باعث بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت صاحب پڑھنا جانتے تھے لیکن عام بول چال میں اس کے معنی محض پکارنے کے اور مرسلانہ بلاہٹ کے بھی ہیں جیسے نبی پکارتا ہے مثلاً عبرانی میں لفظ قارا کے معنی چلانا۔ چنانچہ یسعیاہ ۱۱ باب ۶ آیت میں ہے آواز آئی کہ پکارا اس نے کہا کہ میں کیا پکاروں۔ دیکھو نولدیکی کی کتاب مسمی بہ گشختی قرآن صفحہ ۹، ۱۰ یہ سورۃ مخلوط سورتوں کا ایک کافی نمونہ ہے۔ چھٹی آیت سے لے کر ایام مکہ سے تعلق رکھتی ہے اور ابوجہل اور اس کے رفقا کی مخالفت کا ذکر اس میں اشارۃً درج ہے۔

[2] نولدیکی صاحب گشختی دس قرآن صفحہ ۹۷۔

[3] نولدیکی صاحب فرماتے ہیں کہ اہلِ مکہ کی برافروختگی کا باعث محمد صاحب کی نئی تعلیم نہیں تھی بلکہ آپ کی تعلیم میں اہل مکہ کے بزرگوں پر جو حملے کئے گئے تھے ان کے باعث وہ برافروختہ ہوئے نولدیکی قرآن صفحہ ۳۱۔

خیال (بالکل خیال) نہ تھا کہ محمد صاحب مکہ کے قدیم بُت پرستوں کی رسومات کو جو وہ مانتے تھے اسلام میں داخل کر کے اس خیال کو قائم رکھیں گے۔ علاوہ ازیں آنحضرت نے کوئی معجزہ بھی نہیں کیا تھا اور آپ کے دعوؤں کے ثبوت میں جو کچھ انہوں نے سنا تھا وہ آنجناب کی اپنی ہی باتیں تھیں۔

اس بات کا ظاہر کرنا کچھ دشوار (مشکل) نہیں ہے کہ محمد صاحب ابتدا ہی سے اپنے ہم وطنوں کی خیر خواہی کے خیالات سے موثر تھے۔ اور ان کی یہ کوشش تھی کہ ایک ایسا طریق جاری کریں جس سے اپنے ملک کا بھلا ہو۔

ابنِ اسحاق بیان کرتے ہیں کہ چونکہ لوگ محمد صاحب کی باتوں کو سن کر ان کے رشتہ داروں کی حمایت کے سبب سے برداشت کرتے تھے۔ اس لئے بزرگانِ قریش نے ان کے چچا ابو طالب سے درخواست کی کہ محمد صاحب سے ان کا باہمی عہد و پیمان کرا کر صلح وصفائی کرا دیں۔ جب ابو طالب نے اپنے بھتیجے سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ بہت خوب! آپ مجھ کو ایسا کلمہ بتائیے جس کے وسیلے سے اہلِ عرب پر حکمرانی کروں اور اہلِ فارس مطیع (تابع) ہو جائیں۔ اور علاوہ بریں آپ یہ بھی کہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا خُدا یا معبود نہیں ہے۔ اور بتُوں کی پرستش کو یک لخت (فوراً) ترک کر دیا۔ یوں کہیں کہ محمد صاحب کے اس جواب کا لب لباب (خلاصے کا خلاصہ) یہ ہو سکتا ہے کہ میری تعلیم کو قبول کرو۔ اس سے تمام اہلِ عرب میں یگانگت (اتحاد) پیدا ہو گی اور ان کے دشمن مغلوب (شکست خوردہ) ہو جائینگے۔ چنانچہ اہلِ مکہ نے اس خطرے کو محسوس کر کے جواب دیا کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ سلطنت ہم سے چھین لی جائیگی۔ اسلام کی ابتدائی حالت میں اس کے اس حصّہ کی طرف جو ملک گیری سے علاقہ (تعلق) رکھتا ہے۔ جیسا کہ چاہئے توجہ نہیں کی گئی۔ لہذا اہلِ مکہ نے خیال کیا کہ شاید یہ تعلیم محمدی کے قبول کرنے کا نتیجہ لڑائی اور اس لڑائی کا انجام شکست ہو۔ اس خیال سے ان کی مخالفت اور بھی روز افزوں (آئے دن زیادہ) ہوتی گئی۔ اب وہ آنحضرت کو دروغگو (جھوٹا) جادوگر شاعر آسیب زدہ اور فالگیر وغیرہ ناموں سے پکارنے لگے۔ یہ لوگ یہاں تک غضبناک ہو گئے تھے کہ خاص کعبہ کے دروازہ پر بھی انہوں نے آنحضرت پر حملہ کیا۔ ایک دفعہ آنحضرت نہایت طیش میں آ گئے اور فرمانے لگے کہ اے قریش کے لوگو اس بات کو یاد رکھو کہ میں تلوار لیکر آیا ہوں[4]۔ اس دھمکی کے مطابق عمل کرنے سے کئی سال تک آپ عاجز (بے بس) رہے لیکن قریش نے اس وقت اس بات کو نہ سمجھا اور دوسرے ہی روز پھر حملہ آور ہوئے اس موقعہ پر حضرت ابو بکر کو آنحضرت کی مدد کے لئے آنا پڑا۔

ابنِ اسحاق بیان کرتے ہیں کہ اس روز کوئی غلام یا آزاد ایسا نہ تھا جس نے آنحضرت کو دروغگو (جھوٹا) نہ کہا ہو اور توہین و بے عزتی میں حتی المقدور (جہاں تک ہو سکے) کوشش نہ کی ہو۔ ان تمام تکلیفات میں آپ کے چچا ابو طالب اگرچہ آپ کی تعلیم اور آپ کے دعاوی کے قائل نہ تھے تاہم آپ کے بڑے حامی اور مددگار تھے۔ قبیلہ قریش نے ابو طالب کو بہت کچھ کہا سنا کہ وہ آئندہ محمد صاحب کی مدد نہ کریں۔ لیکن ابو طالب نے ان کی تمام ترغیب و کوشش کا نتیجہ اس امر میں دکھلایا کہ محمد صاحب کو کہنے اور سمجھانے لگے کہ مجھ کو اور اپنے آپ کو بچاؤ اور مجھ پر اس قدر بوجھ نہ ڈال جس کی میں برداشت نہیں کر سکتا پر محمد صاحب اپنے ارادے میں جمے رہے۔ اور آخر کار ان کے چچا ابو طالب نے اپنے قریبی رشتہ کے باعث جو ان میں تھا مجبور ہو کر کہا کہ جو کچھ اچھا لگے سو کئے جا۔ بخُدا کسی حالت میں، میں تجھ کو دشمنوں کے حوالہ نہیں کرونگا۔ حضرت ابو بکر اور آنحضرت کے چند اور پیرو (پیچھے چلنے

---

[4] اس واقعہ سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے آنحضرت ﷺ کے خیالات میں معرکہ آرائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

والے) جو کہ مکہ میں کسی زبردست خاندان سے علاقہ رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کی حقارت وبے عزتی کی جاتی تھی تاہم وہ سب کے سب ہر طرح کے شخصی خطرہ سے محفوظ تھے۔ خاندانی اتحاد وتعلقات ہر طرح کی ایذار سانی کے مقابلہ میں ایک عمدہ پناہ گاہ تھی۔ اچھے خاندان کے لوگ نئی تعلیم کو قبول کرنے یعنی محمدی ہونے کے بعد بھی محفوظ تھے لیکن بر خلاف اس کے اگرچہ حضرت محمد اور ان کے چند پیرو ایسے محفوظ تھے تاہم جو لوگ غلاموں اور ادنی قبائل عرب سے ایمان لائے تھے۔ اور جن کے سرپر اہل مکہ کے زبردست سرداروں کی حفاظت کا سایہ نہ تھا نہایت ستائے جاتے اور قید خانوں میں ڈالے جاتے تھے۔

محمد صاحب اس حالت میں ان کے ساتھ بہت ہمدردی ظاہر کرتے تھے اور اکثر اوقات ان کو ترغیب دیتے تھے کہ یہاں سے بھاگ جاؤ اور اپنے آپ کو اس ایذاو عذاب سے محفوظ رکھو۔ ایک دن آپ کی ایک شخص عمرو نامی سے جو کہ رورہا تھا ملاقات ہوئی۔ آپ کی بازپرس کے جواب میں اس نے کہا کہ یارسول اللہ اگر میں آپ کی توہین اور ان کے معبودوں (بتوں کی تعریف نہ کروں تو میری رہائی ناممکن ہے آپ نے فرمایا کہ تو اپنے دل کو کیسا پاتا ہے ؟یعنی تیرے دل کا کیا حال ہے) اس نے عرض کی کہ میرا دل اخلاص (خلوص) سے ایمان پر قائم ہے۔ اس پر آنحضرت نے فرمایا کہ اگر وہ لوگ تجھ پر پھر ظلم کریں تو جس طرح وہ تجھ سے اقرار کرانا چاہیں کردیجیو اور جو کچھ تجھ سے کہلانا چاہیں کہہ دیجیو۔

اس قسم کے لوگوں کا بیان جن سے زبردستی کفارہ اسلام کا انکار کرواتے تھے قرآن میں بھی مذکور ہے چنانچہ سورہ نحل میں مرقوم ہے۔ **مَن كَفَرَ بِاللّهِ مِن بَعْدِ إيمَانِهِ إِلاَّ مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالإِيمَانِ** یعنی جس شخص نے ایمان لانے کے بعد خُدا کا انکار کیا جبکہ اس کو زبردستی مجبور کیا گیا اور وہ دل میں ایمان پر قائم رہا تو اس کا کچھ گناہ نہیں ہے۔ (سورہ نحل ۱۴رکوع آیت ۱۰۶)۔ اس موقع پر جبکہ آنحضرت کا دل تفکرات (سوچ بچار) کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح جن میں خاص حضرت محمد کی طرف خطاب تھا اور سورۃ الکافرون اور سورۃ الاخلاص لوگوں کی طرف خطاب کرکے آپ کی تسلی کے لئے نازل ہوئیں۔ چنانچہ ان میں مندرج ہے۔ **وَالضُّحَىوَاللَّيْلِ إِذَا سَجَىمَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلَىوَلَلْآخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْأُولَى** (سورہ الضحی آیت ۱تا۳)، **أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَوَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَالَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَوَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَفَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًاإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًافَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْوَإِلَى رَبِّكَ فَارْغَبْ**(سورہ النشراح)۔ **قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَلَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَوَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُوَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْوَلَا أَنتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُلَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ** (سورہ الکافرون) یعنی قسم ہے دوپہر کی روشنی کی اور قسم رات کی جس وقت کہ اس کی تاریکی چھاجاتی ہے۔ تیرا خُدا تجھ سے ناراض نہیں ہے اور اس نے تجھے ترک نہیں کیا۔ یقیناً آئندہ گذشتہ سے بہتر ہوگا۔ کیا ہم نے تیرے لئے نہیں کھول دیا تیرا سینہ اور تجھ سے تیرا بوجھ ہم نے نہیں لے لیا جس سے تیری کمر ٹوٹ رہی تھی ؟اور کیا ہم نے تیرے مذکور کو بلند نہیں کیا؟ سوالبتہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے پھر جب فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے رب کی طرف دل لگا۔ کہہ دے کہ اے کافرو جس کی تم پرستش کرتے ہو میں اس کو نہیں پوجتا اور جس کو میں پوجتا ہوں تم اسکو نہیں پوجتے جس کی تم پوجا کرتے ہو میں

اسے کبھی نہیں پوجونگااور وہ جس کی میں پوجا کرتا ہوں تم اس کو نہیں پوجو گے۔ پس تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین کافی ہے۔[5] کہہ دے کہ خُدا ایک ہی خُدا ازلی ہے وہ کسی کو جنتا نہیں ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہے۔ اور اسکی مانند کوئی نہیں ہے[6]۔ اسی طرح ان سورتوں سے پژمردگی اور کمال کے زمانہ میں آنحضرت کی کھلم کھلا الہامات سے ہمت بڑھ گئی اور بڑے زور شور سے بُت پرستی کی تردید (رد کیا گیا) اور خُدا تعالیٰ کی وحدانیت خیالات میں مصروف و مشغول (شغل میں لگا ہوا) ہوئے۔

سلسلہ وار سورتوں میں سے جب فاطر ختم ہوگئی تو سورۃ الاثر[7] نازل ہوئی۔ جس کے بعد الہامات و مکاشفات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی تھی جب کہ حضرت محمد پر لوگ تمسخر (مذاق) اڑاتے اور شاعر فالگیر اور ملحد (کافر۔ بے دین) وغیرہ کے ناموں سے نامزد کرتے تھے اور کہتے تھے۔ کہ یہ اپنی لغو بیانی (برکار باتوں۔ بکواس) اور بیہودہ گوئی سے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ پھر یہ الفاظ کہ **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ** یعنی اوّلحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ اور لوگوں کو خبردار کر (سورہ مدثر کی پہلی آیت) اس امر پر صاف دلالت (دلیل) کرتے ہیں کہ اس کو بلا پس و پیش کئے وعظ نصیحت کرنے کا حکم ملا۔

اہلِ مکہ نہایت تند (سخت) اور سرکش تھے اور مفسر ابنِ عباس کے بیان کے مطابق حضرت محمد کی مخالفت میں ان کا سرگروہ مکہ کا ایک بڑا بھاری رئیس ولید بن مغیرا تھا۔ جس کا ذکر ذیل کی ملامت (لعن طعن) آمیز آیات میں اشارتاً کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورہ مدثر کی گیارھویں آیت سے یوں شروع ہوتا ہے کہ **ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا وَبَنِينَ شُهُودًا وَمَهَّدتُّ لَهُ تَمْهِيدًا ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيدَ كَلَّا إِنَّهُ كَانَ لِآيَاتِنَا عَنِيدًا سَأُرْهِقُهُ صَعُودًا إِنَّهُ فَكَّرَ وَقَدَّرَ** یعنی چھوڑ دے[8] مجھ کو اور اس شخص کو جس کو میں نے پیدا کیا اکیلے اور دیا میں نے اس کو پھیلا کر۔ اور اس کے بیٹے اس کے سامنے بود و باش (قیام) کرتے ہیں۔ اور میں نے تیار کر دی اس کی خوب تیاری پھر لالچ کرتا ہے کہ میں اس کو اور دوں۔ کوئی نہیں وہ ہے ہماری آیتوں کا مخالف۔ اب اسے چڑھاؤنگا بڑی چڑھائی۔ اس نے سوچ کیا اور دل میں ٹھہرایا۔ سو مارا جائیو کیسا ٹھہرایا۔

ولید بن مغیرا نے کہا تھا کہ حضرت محمد کا کلام جس کو وہ کلام الہیٰ کہتا ہے محض انسانی کلام ہے۔ اور اس کو وہ خود سحری تاثیر کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ چنانچہ اس پر اسکے حق میں یہ فتویٰ سنایا گیا کہ **سَأُصْلِيهِ سَقَرَ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ** یعنی اب اس کو ڈالونگا آگ میں اور تو نے بوجھا کیا ہے وہ آگ؟ نہ باقی رکھے نہ چھوڑے۔ نظر آتی ہے پنڈے پر (سورہ مدثر ۲۶-۲۹)۔

---

[5] یہ سورۃ اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ اہل مکہ میں سے ایک سردار نے یہ بات پیش کی تھی کہ محمد صاحب کے خُدا کی بھی اسی وقت پرستش ہوا کرے جس وقت دیگر اہلِ مکہ کے معبودوں کی ہوتی ہے یا ہر سال باری باری ہوا کرے۔ حضرت محمد اس دام تزویر میں نہ پھنسے اور اس سورۃ میں قدیمی بُت پرستی کی صاف تردید کی اور دوسری سورۃ میں خُدا تعالیٰ کی توحید اور وحدانیت پر نہایت پرزور گواہی دی۔

[6] **قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ اللَّهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ**

[7] اہل اسلام کے عام مفسرین کا اس امر میں اتفاق ہے کہ سورہ فاطر کے بعد پہلے یہی صورت نازل ہوئی تھی۔ اور پہلی سات آیات اس امر کی تائید کرتی ہیں کیونکہ آٹھویں آیت میں جملہ نفر فی النفقور پہلی سورتوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ لیکن ساتھ ہی یہ سورۃ مخلوط المضمون معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ۱۱ آیت میں مندرج ہے کہ چھوڑ دے مجھے کو اور جس کو میں نے پیدا کیا اکیلے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان مخالفوں کی طرف اشارہ ہے جو کافروں میں سے تھے اور کہتے ہیں کہ اس سے ولید بن مغیرا مراد ہے۔ ۳۱، ۳۴ ویں آیت تک ان مخالفوں کا ذکر ہے جو مدینہ میں تھے اور ان میں یہودی منکر ریاکار اور بُت پرستی بھی شامل ہیں۔ ان گروہوں کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیتیں ضرور اس آخری زمانہ میں اس سورۃ میں درج کی گئی ہونگی۔

[8] یہ ترجمہ شیخ عبدالقادر ابن شاہ ولی اللہ دہلوی کا ہے۔

پھر سورہ قلم میں اسی شخص کے حق میں لکھا ہے کہ **حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ** یعنی قسمیں کھانے والا بے قدر طعنے دینا چغلی کرتا پھرتا ہے بھلے کام سے روکتا۔ حد سے بڑھتا۔ بڑا گنہگار اس سب کے پیچھے بدنام جب اس کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو پہلوں کی نقلیں ہیں اب داغ دینگے ہم اس کی سونڈ پر۔

آنحضرت کا ایک اور سخت مخالف آپ کا چچا ابو لہب تھا۔ جس نے اپنی زوجہ سے آپ کی مخالفت کے لئے تحریک پائی اور نہایت برافروختہ ہو کر آپ کے دعویٰ کی تردید میں بڑے زور وشور سے مصروف ہوا۔ سورۃ اللہب میں ابو لہب اور اس کی زوجہ دونوں کے حق میں نہایت سخت لعنت سنائی گئی چنانچہ لکھا ہے کہ **تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ مَا أَغْنَىٰ عَنْهُ مَالُهُ وَمَا كَسَبَ سَيَصْلَىٰ نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وَامْرَأَتُهُ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ** یعنی ٹوٹ گئے ہاتھ ابی لہب کے اور ٹوٹ گیا وہ آپ۔ نہ کام آیا اس کا مال اور نہ جو کمایا۔ اب شعلہ زن بھڑکتی ہوئی آگ تاپیگا اور اسکی جورو بھی جو سر پر ایندھن لئے پھرتی ہے۔ اور اس کی گردن میں کھجور کے پٹھے کی رسی ہے [9]۔

سورۃ الہمزہ اجناس ابن شریف ایک مالدار آدمی کی مخالفت میں نازل ہوئی اور یہ بھی اسی زمانہ سے تعلق رکھتی ہے اگرچہ نولدیکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے علماء اسلام اس کو ایامِ مدینہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس سورۃ کی عبارت یوں ہے کہ **وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ نَارُ اللَّهِ الْمُوقَدَةُ الَّتِي تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ** یعنی خرابی ہے ہر طعنہ دینے اور عیب (نقص، گناہ) چننے والے کی۔ جس نے سمیٹا مال اور گن گن رکھا۔ کیا خیال رکھتا ہے کہ اسکا مال سدا رہیگا اس کے ساتھ؟ کوئی نہیں۔ اس کو پھینکا ہے روندنے والی میں۔ اور تو کیا بوجھا۔ کیا ہے وہ روندنے والی؟ آگ ہی اللہ کی سلگائی ہوئی جھانک لیتی ہے دل کو۔

پھر سورعلق میں آپ کے ایک اور سخت مخالف ابو جہل [10] کے حق میں مرقوم ہے کہ **كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ أَن رَّآهُ اسْتَغْنَىٰ** یعنی کوئی نہیں آدمی سر چڑھتا ہے یہ اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو محفوظ دیکھتا ہے۔ (سورہ علق آیت ۶، ۷)

بیضاوی فرماتے ہیں کہ ابو جہل نے آنحضرت کو یہ دھمکی دی تھی کہ جب آپ نماز میں سجدہ کر رہے ہونگے تو اس وقت آپ کی گردن پر کھڑا ہو جائیگا۔ [11]

پھر سورۃ الحج کی ۸ ویں آیت میں یوں مندرج ہے کہ **وَمِنَ النَّاسِ مَن يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَلَا هُدًى وَلَا كِتَابٍ مُّنِيرٍ** یعنی ایک شخص ہے جو جھگڑتا ہے ان کی بات میں بن خبر بن سوجھ اور بغیر روشن کتاب کے۔ واضح رہے کہ یہ سورۃ مدنی ہے اور اس کا حوالہ تواریخی اور زمانہ گذشتہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن بعد کی سورتوں میں بھی اس قسم کے الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ بعد کی ایک مدنی سورۃ یعنی سورۃ الانفال

---

[9] اگر وہ سب کچھ جو احادیث میں ابو لہب کی نسبت بیان کیا گیا ہے ٹھیک ہے تو یہ سورۃ نہایت دلچسپ اور قابل لحاظ ہے۔ کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس حالت میں حضرت محمد تھے کس قدر قرآن کے الفاظ پر بھی ان کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنی قوم کے لوگوں کو بلایا اور ان کے سامنے اپنے دعاوی کو پیش کیا۔ ابو لہب نہایت برافروختہ (غصے میں بھرا ہوا) ہوا اور کہنے لگا کہ کیا تو نے مجھ کو اس لئے بلایا ہے؟ تو ہلاک ہووے کہہ کر ابو لہب نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک پتھر اٹھا کر محمد صاحب کی طرف پھینکا جس پر اس کے حق میں یہہ کہا گیا کہ تیرا ہاتھ ٹوٹ جاوے۔ ابو لہب کی زوجہ ام جمیل نے آپ کے راستے میں کانٹے ڈال دیئے۔ ایک دن وہ ایندھن کی لکڑیوں کا گٹھا سر پر اٹھائے ہوئے جا رہی تھی اور رسی اس کی گردن میں پڑی ہوئی تھی اور وہ گلا گھونٹ کر مر گئی اس پر اسے آنحضرت نے پھانسی ملی ہوئی کے نام سے نامزد کیا۔ سورۃ لہب میں ابو لہب کے نام مضحکہ اڑایا گیا ہے کیونکہ ابو لہب کے معنی شعلوں کا باپ ہیں۔

[10] ابو جہل جنگ بدر میں قتل کیا گیا۔

[11] راڈویل کا قرآن صفحہ ۲۔

کی ۴۷ویں آیت میں لکھا ہے کہ **وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ** یعنی مت ہو جیسے وہ اہلِ مکہ جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھاتے اور اللہ کی راہ سے روکتے ہوئے اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ اس تمام مخالفت کے مقابلہ میں حضرت محمد کو فقط یہ کہنے کا ارشاد ہوا کہ وہ خُدا کی طرف سے ہے چنانچہ سورہ قلم کی دوسری آیت میں سطور ہے **مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ** یعنی اے محمد تو اپنے رب کے فضل سے دیوانہ نہیں ہے۔

اب ایک دو سال کے عرصہ میں وحی آسمانی کا خیال زیادہ تر تکمیل کو پہنچ گیا اور آنحضرت صحت بیان اور درستی کا نہایت مستعدی (آمادگی، تیاری) اور سرگرمی سے دعویٰ ہونے لگا۔ ان الہامات کی عبارت کی نسبت صرف اسی پر اکتفا (اتفاق) نہیں کی گئی کہ اس کو کلام اللہ اور اسکے الفاظ کو خُدائے تعالیٰ کے الفاظ کہیں۔ بلکہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عرش معلیٰ (عالی آسمان) پر ازل سے یہ کلام موجود تھا۔ چنانچہ سورہ بروج کی اکیسویں آیت میں پایا جاتا ہے کہ **بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ** یعنی یہ بڑی شان و عظمت والا قرآن ہے جو کہ لوحِ محفوظ پر لکھا ہوا ہے۔

لوحِ محفوظ کی نسبت یوں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک خفیہ تختی ہے جو اللہ جل جلالہ کے تختِ بریں اور عرش معلیٰ کے پاس ہے۔ چنانچہ سورہ عبس کی ۱۳ویں آیت اور ۱۴ویں آیت میں یوں لکھا ہے **فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ** یعنی لکھی ادب کے ورقوں میں۔ اونچے دھری ستھری۔ ہاتھوں میں لکھنے والوں کے جو سردار ہیں نیک۔ مفسر زمکشاری اس کا یوں بیان کرتا ہے کہ لوح محفوظ سے نقل کر کے شیاطین کے ہاتھوں سے پاک اور محفوظ رکھا گیا۔ اور صرف پاک فرشتگان ہی اسے چھو سکتے تھے۔ اب آنحضرت کی بڑے شد و مد (زور و شور) سے مخالفت ہونے لگی۔ اور ابتدائی زمانہ کی مکی سورتوں میں سے سورۃ المرسلت میں اس مخالفت کے مقابلہ میں نہایت زجر و توبیخ (لعنت ملامت) کی گئی۔ پچاس آیت میں دس دفعہ یہ فقرہ دہرایا گیا ہے کہ **وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ** یعنی خرابی ہے اس روز جھٹلانے والوں کے لئے۔ انتالیسویں آیت سے حضرت محمد کا مخالفین کو مقابلہ کے لئے پکارنا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ یوں لکھا ہے کہ **فَإِن كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ فَكِيدُونِ** یعنی اگر تمہارا کچھ دعویٰ ہے تو مجھ پر چلا لو[12]۔ پھر اس زجر و عتاب (ملامت و غصہ) کا خاتمہ اس سخت خطاب سے یوں ہوتا ہے کہ **انطَلِقُوا إِلَىٰ مَا كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ انطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ لَّا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ** یعنی جس دوزخ کو تم جھٹلاتے تھے اب اس میں داخل ہو اور ایک سایہ کی طرف چلو جو کہ تین پھاٹکوں والا ہے اور تپش کے دن کسی کام نہیں آسکتا۔

پھر سورۃ النبا میں ۲۱ویں آیت سے ۲۳ ویں[13] آیت تک اسی مضمون پر یوں مرقوم ہے **إِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا لِّلطَّاغِينَ مَآبًا لَّابِثِينَ فِيهَا أَحْقَابًا لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا جَزَاءً وِفَاقًا إِنَّهُمْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ حِسَابًا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كِذَّابًا** کہ بیشک دوزخ ہے تاک (نگاہ) میں شریروں کا ٹھکانہ۔ رہتے ہیں اس میں قرنون۔ نہ چکھیں وہاں کچھ مزا ٹھنڈک کا اور نہ کچھ پینے کو ملے مگر گرم پانی اور بہتی پیپ (ریشہ جو زخموں میں پڑ جاتا ہے)۔ بدلہ ہے پورا۔ کیونکہ وہ حساب کی توقع نہ رکھتے تھے اور ہماری آیات کو جھٹلایا اور واہیات کے نام سے نامزد کیا۔ اور ہر چیز ہم نے گن رکھی ہے لکھ کر۔ اب چکھو! ہم تم پر سوائے مار کے اور کچھ نہیں بڑھائینگے۔

---

[12] ایسے ہی سورۃ الطارق کی ۱۵ویں اور ۱۶ویں آیت میں مسطور ہے کہ وہ تیرے خلاف بند شیں باندھتے ہیں اور میں انکے خلاف بندش باندھونگا۔ بعض اس سورت کو حبشستان کی طرف مہاجرت کے وقت خیال کرتے ہیں۔ اس تعلق میں ابتدائی مدنی سورتوں میں سے سورہ اعراف کی ۲۳ویں آیت قابل لحاظ ہے۔

[13] اس سے ابتدائی مکی سورتوں کے بحور و قوافی اور انکے طرز بیان کا کس قدر اندازہ ہو سکتا ہے۔

سورہ بروج میں ان مظالم کا جو شروع میں معتقدانِ اسلام کا حصّہ تھے اور مومنین کو ستانے اور اذیت پہنچانے والوں کے سزایاب ہونے کا ذکر یو ں ہے۔ کہ جہنم کا عذاب اور اس کی سوزش (جلن، تکلیف) ان کے (مخالفین کے) انتظار میں ہیں[14]۔ جنہوں نے آنحضرت کی مخالفت اختیار کی ان کے حق میں اس تمام سخت گوئی کو قائم کرنے کے لئے سامعین سے یوں کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت صاحب کی اپنی باتیں نہیں ہیں بلکہ قرآن مجید کی آیات ہیں جو کہ لوح محفوظ پر لکھا ہوا ہے یعنی یہ خود خُدائے تعالیٰ کا کلام ہے۔

اس قسم کی عام ملامت (لعن طعن) سے جو کفارہ کی آئندہ بد حالی کا بیان کرتی تھی بعض اوقات چند روزہ وبال اور اسی دُنیا میں عذاب نازل ہونے کی دھمکی کا کام لیا جاتا تھا۔ جس طرح زمانہ قدیم میں خُدا تعالیٰ نے کسی شہر کو برباد نہیں کیا جب تک کہ پہلے اس میں اپنی طرف سے رسول نہ بھیجے اسی طرح اب بھی ہوگا۔ چنانچہ سورہ شعرا کے ۱۱ویں رکوع میں یوں لکھا ہے کہ **وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا مُنذِرُونَ ذِكْرَى وَمَا كُنَّا ظَالِمِينَ** یعنی کوئی بستی نہیں کھپائی ہم نے جس کو نہ تھے ڈر سنانے والے یاد دلانے کو اور ہمارا کام نہیں ظلم کرنا۔ پھر سورۃ حجر کی چوتھی اور پانچویں آیات میں یوں مندرج ہے کہ **وَمَا أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ إِلاَّ وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُومٌ مَّا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ** یعنی کوئی بستی ہم نے نہیں کھپائی مگر اسکا لکھا تھا مقرر۔ نہ شتابی (جلدی) کرے کوئی فرقہ اپنے وعدہ سے اور نہ دیر کرے۔ جب ان کے دل سخت ہو گئے اور ایمان نہ لائے تو ان پر نگہبان ایسی حالت میں دردناک عذاب نازل ہوا جبکہ وہ بالکل گمان (خیال) نہ کرتے تھے[15]۔

ممکن ہے کہ اہل مکہ پر کچھ عرصہ کے لئے عذاب مذکورہ کی نسبت بار بار سننے سے کچھ رعب وخوف چھا گیا ہو۔ لیکن جب مدت تک کوئی عذاب نازل نہ ہوا تو ان کی حیرت دور ہو گئی اور بے ایمانی بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ وہ اب آنحضرت کی معاتب (خفا کرنے والی) تقریروں کے مقابلہ میں بہت برا بھلا کہنے لگے اور عذاب موعودہ کے خواستگار ہوئے اور اختیار من اللہ کے ثبوت میں معجزات طلب کرنے لگے۔ اب وہ یہ یوں کہنے لگے **لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الأَرْضِ يَنبُوعًا أَوْ تَكُونَ لَكَ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الأَنْهَارَ خِلالَهَا تَفْجِيرًا أَوْ تُسْقِطَ السَّمَاء كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا أَوْ تَأْتِيَ بِاللّهِ وَالْمَلآئِكَةِ قَبِيلاً** یعنی ہم نہ مانینگے تیرا کہا جب تک تو بہا نکالے ہمارے واسطے زمین سے ایک چشمہ یا ہو جاوے تیرے واسطے ایک باغ کھجور اور انگور کا پھر بہالے تو اس کے بیچ نہریں چلا کر۔ یا گرادے آسمان پر ہم جیسا کہا کرتا ہے ٹکڑے ٹکڑے۔ یا لے آ اللہ کو اور فرشتوں کو ضامن (سورہ بنی اسرائیل دسواں رکوع)۔ پھر سورہ رعد کی آٹھویں آیت میں یوں لکھا ہے کہ **وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلاَ أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ** یعنی اور منکر کہتے ہیں۔ کیوں نہ اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب سے؟

حضرت محمد کو اس امر کا اقرار کرنا پڑا کہ اس کے پاس اس قسم کا کوئی نشان نہ تھا۔ لیکن آنحضرت نے ایک اس مضمون کا الہام پیش کیا کہ خُدا تعالیٰ مکہ کے سرکش لوگوں پر کسی قسم کا کوئی نشان ظاہر نہیں فرمائیگا۔ چنانچہ اس امر کے اظہار کے لئے جس کو آپ محض خام خیالی خیال فرماتے تھے انجام تک نہیں پہنچ سکتی۔ سورہ حجر کی ۸ویں آیت میں یوں بیان فرمایا ہے **مَا نُنَزِّلُ الْمَلآئِكَةَ إِلاَّ بِالْحَقِّ وَمَا كَانُواْ إِذًا مُّنظَرِينَ** یعنی ہم نہیں اتارتے فرشتوں کو مگر کام ٹھہرا کر اور اس وقت ان کو مہلت نہ ملیگی۔

---

[14] اگر آٹھویں آیت سے گیارھویں آیت تک بعد میں نازل ہوئی ہوں جن سے کہ طرز بیان میں کچھ تبدیلی متصور ہو سکے تو یہی مطلب مراد ہو سکتا ہے۔

[15] دیکھو سورہ شعراء آیات ۲۰۱ و ۲۰۲

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ ان لوگوں کے واقعات دیکھ کر جو ان سے پیشتر گزر گئے ہیں ایمان نہیں لاتے اور اگر حال کے پیغمبر اور اس کے عبرت انگیز پیغام کو رد کرتے ہیں۔ تو وہ پھر اور کسی طرح سے ایمان نہیں لائینگے۔ چنانچہ سورہ حجر کی ۱۴ اور ۱۵ آیت میں یوں مرقوم ہے **وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِم بَابًا مِّنَ السَّمَاءِ فَظَلُّواْ فِيهِ يَعْرُجُونَ لَقَالُواْ إِنَّمَا سُكِّرَتْ أَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُورُونَ** یعنی اگر ہم کھول دیں ان پر دروازے آسمان کے اور تمام دن چڑھتے رہیں تو آخر یہی کہینگے۔ کہ ہماری نگاہ ہی بند ہو گئی ہے اور ہم پر جادو کیا گیا ہے۔ اس قسم کی آیات میں سے سب سے بڑھ کر وہ آیت ہے جو کہ ایام مکہ کے وسط میں نازل ہوئی اور جس میں یوں استدلال (دلیل۔ ثبوت) کیا گیا ہے کہ آنحضرت کو معجزات کی طاقت دینا بالکل بے سود تھا[16]۔

کیونکہ اس قسم کے انعام اور بخششیں انبیائے سلف (سابقہ) کے وقت میں صاف طور پر بے فائدہ ثابت ہو چکی تھیں۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل کے چھٹے رکوع میں اس طرح مرقوم ہے **وَمَا مَنَعَنَا أَن نُّرْسِلَ بِالْآيَاتِ إِلَّا أَن كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ** یعنی اور ہم نے اسی سے موقوف (منسوخ کیا گیا) کیں نشانیاں بھیجنی کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ مخالفین نے معجزہ طلب کرنے میں اصرار کیا پر آپ یہی کہتے رہے کہ قرآن بذاتہ ایک خاص معجزہ ہے اور اسی کو مہر نبوت گردانتے (تسلیم کرنا) رہے۔

قیامت کی تعلیم کو اہلِ مکہ محض توہمات تصور کرتے تھے۔ جب اس سلسلہ میں آیات نازل ہوئیں تو کہنے لگے کہ یہ سب کچھ محمد صاحب نے ان لوگوں سے سنا ہوا ہے جو کہ اور ملکوں سے آکر مکہ میں بود و باش کر رہے ہیں۔ اور یہ سب باتیں اگلے لوگوں کی کہانیاں اور شاعرانہ خیال کا نتیجہ ہیں۔ سورۃ الطفیف[17] جو کہ آنحضرت کی بشارت کے شروع میں مکہ میں نازل ہوئی تھیں۔ اس کی ۱۰ ویں آیت سے ۱۷ ویں آیت تک یوں مرقوم ہے کہ **وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِينَ الَّذِينَ يُكَذِّبُونَ بِيَوْمِ الدِّينِ وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ إِذَا تُتْلَى عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ ثُمَّ يُقَالُ هَذَا الَّذِي كُنتُم بِهِ تُكَذِّبُونَ** یعنی خرابی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی جو جھوٹ جانتے ہیں انصاف کا دن اور اس کو جھٹلاتا ہے وہی جو بڑھ چلنے والا گنہگار ہے۔ جب سنائی جاتی ہیں اس کو ہماری آئتیں کہتا ہے کہ یہ پہلو کی نقلیں ہیں۔ بے شک انکی بدکاری ان کے دلوں پر غالب (زور آور) ہے۔ البتہ وہ اس دن اپنے رب سے روکے جائینگے۔ پھر وہ ضرور آتش دوزخ (دوزخ کی آگ) کا لقمہ ہونگے۔ پھر ان سے کہا جائیگا کہ یہ وہی ہے جس کو تم جھوٹ جانتے تھے۔

اگر یہ خیال کیا جائے کہ مذکورہ بالا آیات ایک ابتدا کی صورت سے اقتباس کی گئی ہیں تو پھر کچھ آگے چل کر یہی عبارت جس کا نازل ہونا مکہ ہی میں ثابت ہے سورہ فرقان کی پانچویں اور چھٹی آیات میں مندرج ہے۔ **وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاؤُوا ظُلْمًا وَزُورًا وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا** ترجمہ۔ اور کہنے لگے جو منکر (انکار کرنے والے) ہیں اور کچھ نہیں یہ مگر جھوٹ باندھ لایا ہے۔ اور ساتھ دیا ہے کہ اس میں اس کا اور لوگوں نے۔ سو آئے بے انصافی اور جھوٹ پر اور کہنے لگے یہ نقلیں ہیں پہلوں کی جو لکھ لیا ہے اور لکھوائی جاتی ہیں اُس پاس صبح اور شام۔

---

[16] اس امر کے بیان کی کچھ ضرورت نہیں کہ آنحضرت معجزات کے دکھانے سے قاصر رہے کیونکہ قرآن میں یہ امر نہایت صفائی سے مندرج ہے پر تعجب ہے کہ علمائے اسلام اس کو نہیں مانتے سیل کا رسالہ عقیدہ اسلام صفحہ ۲۱۸۔

[17] بعض مفسرین اس سورت کا مدنی بیان کرتے ہیں اور بعضوں کا خیال ہے کہ یہ بعضوں کا خیال ہے کہ یہی بعد کی مکی سورتوں میں سے ہے لیکن میور اور نولدیکی اس کو آنحضرت کی بشارت کے چوتھے سال کی مکی سورتوں میں شمار کرتے ہیں۔

ابتدائی زمانہ کی مکی سورتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی عبارت نہایت فصاحت (خوش کلامی) سے پُر اور شاعرانہ رنگ میں رنگی ہوئی ہے تاہم آنحضرت کے دل پر شکوک کے بادل چھارہے تھے۔ جن قسموں کی ذریعہ سے آپ اپنی تعلیم کو لوگوں کے دلوں میں بٹھانا چاہتے تھے نہایت عجیب اور قابلِ غور ہیں۔ آنحضرت کے اس زمانہ کی طرز زندگی کو وہ سخت اور قہر آلودہ (زبردستی) حملے جو آپ نے مخالفین پر کئے نہایت صفائی سے ظاہر کرتے ہیں۔[18] تمام قرآن میں یہ سورتیں سب سے عمدہ ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ حضرت محمد کے جوش و خروش اور تشویش کی کچھ حد نہ تھی۔ آپ نے اہلِ مکہ سے ان کے حقوق پیش کر کے صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ سورہ فیل میں یوں لکھا ہے **أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحَابِ الْفِيلِ أَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِي تَضْلِيلٍ وَأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيلَ تَرْمِيهِم بِحِجَارَةٍ مِّن سِجِّيلٍ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُولٍ** ترجمہ۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے ہاتھی والوں سے؟ نہ کر دیا ان کا داؤ غلط؟ اور ان پر ابابیل پرندوں کو بھیجا۔ پھینکتے ان پر پتھریاں کنکر کی۔ پھر کر ڈالا ان کو جیسا بُھس (کھائے ہوئے اناج کا چھلکا) کھایا ہوا۔

اس مذکورہ بالا سورۃ میں اہلِ مکہ کے اس لشکرِ جرار سے رہائی پانے کی طرف اشارہ ہے جو شاہ حبش (نجاشی) کی طرف سے آنحضرت کی پیدائش کے وقت کعبہ کو منہدم (گرانا) کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ پھر سورۃ القریش کی تیسری اور چوتھی آیات میں کعبہ شریف اور اس کے علاقہ کی حفاظت کا یوں ذکر ہے **فَلْيَعْبُدُوا رَبَّ هَٰذَا الْبَيْتِ الَّذِي أَطْعَمَهُم مِّن جُوعٍ وَآمَنَهُم مِّنْ خَوْفٍ** ترجمہ: تو چاہئے بندگی کرنی اس گھر کے رب کی جس نے کھانا دیا اور ان کو بھوک میں اور امن دیا ڈر میں۔ نیز سورۃ التین کی پہلی تین آیات اور سورہ طور کی پہلی چار آیات میں بھی اسی امر کو حلفاً پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ التین میں مرقوم ہے۔ **وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ وَهَٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ** ترجمہ قسم انجیر کی اور زیتون کی اور طورِ سینین کی اور شہر امن والے کی اور سورہ طور میں مندرج ہے **وَالطُّورِ وَكِتَابٍ مَّسْطُورٍ فِي رَقٍّ مَّنشُورٍ وَالْبَيْتِ الْمَعْمُورِ** ترجمہ: قسم ہے طور کی اور لکھی کتاب کی کشادہ ورق میں۔ اور آباد گھر کی۔

ان متذکرہ بالا حوالجات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد اپنے ایام مکہ کے آغاز میں کعبہ کی جو اہلِ عرب کا مقدس مقام تھا نہایت تعظیم و تکریم (عزت کرنا) کرتے تھے۔

اب حضرت محمد نے ایک نئے پیرایہ تقریر کو اختیار کیا اور انسانی طبعیت کے حیوانی و شہوانی پہلو کی طرف مائل ہوئے۔ چنانچہ آپ نے اپنے پست ہمت اور خستہ خاطر پیروؤں کی جماعت کی ہمت بڑھانے کے لئے بہشتی خوشیاں لینے عروسی پلنگوں مشک و کستوری (وہ خوشبودار سیاہ رنگ کا مادہ جو نیپال، تبت، تاتار، خطا اور ختن میں ایک خاص قسم کے ہرن کی ناف سے نکلتا ہے) اور شراب طہور کا نقشہ کھینچ دکھایا اور بیان کیا کہ بہشت کی خاص خوشیوں میں سے مومنین کے لئے ایک بڑی خوشی یہ بھی ہوگی کہ جب وہ عروسی سیجوں پر حور و غلمان کے ساتھ عیش کرینگے اور متلذذ (مزہ چکھنے والے) ہونگے۔ اس وقت کفار پر نظر کرینگے اور ان کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر ازراہِ حقارت ہسینگے۔ اس بیان کو مفسرین یوں سمجھاتے ہیں کہ بہشت اور دوزخ کے درمیان ایک دروازہ کھولا جائیگا اور دوزخیوں کو اس کھلے دروازہ کی طرف بلایا جائیگا۔ وہ بڑی امید و آرزو سے بھاگتے ہوئے آئینگے لیکن جونہی کہ وہ دروازہ پر پہنچینگے دروازہ بند ہو جائیگا۔ اس پر اہلِ جنت جو کہ نفسانی خوشیوں میں مشغول (مصروف) ہونگے اہلِ جہنم کی مایوسی پر مضحکہ (مذاق) اڑائینگے اور اسی طرح اپنی عیش و عشرت کو دوبالا کرینگے۔ اس وقت بہشت و دوزخ کے نقشے نہایت مشرح (صاف) اور واضح طور پر بیان کئے گئے تھے اور اس سے

[18] دیکھو نولدیکی کا گشختی دس قرآن صفحہ 78، 60

محض یہی غرض نہ تھی کہ ابتدائی زمانہ کے مسلمان اپنی مشکلات میں ہمت نہ ہاریں بلکہ کفارہ ومخالفین کو مرعوب ومغلوب (ڈرنے والا۔ہاراہوا) کرنا بھی بدرجہ عنایت ملحوظ ومتصور (خیال وتصور کرنے والا) تھا۔ بہشت کی خوشیاں یہ ہیں کہ وہاں ہر طرح سے آرام وآسائش مہیا ہوگی۔اہلِ جنت کا لباس حریری (ریشمی) ہوگا۔خوشبو اور شراب بکثرت ہوگی۔پلانے کے لئے نہایت خوبصورت غلام خدمت میں کھڑے ہونگے اور علاوہ اس کے یہ تمام عیش وعشرت منانے کا موقع ایسا ہوگا کہ وہاں کے نظارہ سے حواس میں فرحت (خوشی) اور تازگی پیدا ہوگی۔ بہشت کے اس تحریص (لالچ دینے والا) دہ بیان کی کشش کی تکمیل کے لئے ذیل کی آیات پیش کی جاتی ہیں۔اوّل سورۃ النبا میں ۳۱ سے ۳۴ آیت تک یوں لکھا ہوا ہے۔**إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ مَفَازًا حَدَائِقَ وَأَعْنَابًا وَكَوَاعِبَ أَتْرَابًا وَكَأْسًا دِهَاقًا** یعنی بے شک ڈر والوں کو مراد ملنی ہے۔ باغ ہیں اور انگور اور نوجوان ونارپستان (نوجوان لڑکی کی چھاتیاں) عورتیں ایک عمر کی سب۔ اور پیالہ چھلکتا۔ دوم سورۃ الواقعہ کی ۲۲ اور ۳۴ آیات میں مندرج ہے۔ **وَحُورٌ عِينٌ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا عُرُبًا أَتْرَابًا** ترجمہ: اور گوریاں بڑی آنکھوں والیاں برابر لپٹے موتی کے۔ ہم نے دی عورتیں اٹھائیں ایک اٹھان پر۔ پھر کیا ان کو کنواریاں۔ سوم سورۃ الطور کی ۲۰ ویں آیت میں مسطور ہے **مُتَّكِئِينَ عَلَى سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ وَزَوَّجْنَاهُم بِحُورٍ عِينٍ** ترجمہ۔ لگے بیٹھے تختوں پر برابر بچھی قطار۔اور بیاہ دیں ہم نے ان کو گوریاں بڑی آنکھوں والیاں۔ پھر سورۃ الصافات جو کہ ایام مکہ کے وسط کی خیال کی جاتی ہے اس کی ۴۰ ویں آیت سے ۴۷ ویں آیت تک میں یوں مرقوم ہے کہ **اوّلئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ فَوَاكِهُ وَهُم مُّكْرَمُونَ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ عَلَى سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ يُطَافُ عَلَيْهِم بِكَأْسٍ مِن مَّعِينٍ بَيْضَاء لَذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ لَا فِيهَا غَوْلٌ وَلَا هُمْ عَنْهَا يُنزَفُونَ وَعِندَهُمْ قَاصِرَاتُ الطَّرْفِ عِينٌ كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ** ترجمہ: جو ہیں ان کو روزی ہے مقرر۔ میوے اور ان کی عزت ہے۔ باغوں میں نعمت کے تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے۔ لوگ لئے پھرتے ہیں ان کے پاس پیالہ شراب نتھری کا۔ سفید رنگ مزا دیتی پینے والوں کو۔ نہ اس سے سر پھرتا ہے اور نہ اس سے بہکتے ہیں۔اور ان کے پاس ہیں عورتیں نیچی نگاہ رکھتیاں بڑی آنکھوں والیاں گویا انڈے ہیں چھپے دھرے۔ بہشت کے اس بیان کی نسبت گبن صاحب طنزاً فرماتے ہیں کہ حضرت محمد نے اہل جنت کے ہم صحبتان ذکور (مرد) کا بالکل بیان نہیں کیا اور اس کی تشریح سے اس لئے کترا گئے کہ مبادا (خُدانہ کرے) پہلے شوہروں کے دلوں میں حسد کی آگ مشتعل ہو یا شاید نکاح کے ابدی اور دائمی رشتہ کے شکوک سے کسی طرح ان کے آرام وآسائش میں خلل واقع ہو۔ جبکہ سب مومنین اور مومنات بہشت میں دوبارہ شباب کے عالم میں ہونگے۔ تو انصاف اس امر کا متقاضی (تقاضا کرنے والا) ہے کہ اناث (عورتیں) کو بھی وہی آزادی اور حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ جو کہ ذکور (مرد) کو ہونگے پر آنحضرت اپنی تعلیم کے اس صحیح اور صریح (واضح) نتیجہ کو صاف اڑا گئے اور اس کے بیان سے عمداً پہلو تہی (دامن بچانا) کیا۔

بہشت کے اس مذکورہ بالا بیان کی نسبت اب خواہ مخواہ یہ سوال پیش آتا ہے کہ آیا یہ فی الواقعہ لفظی طور پر صحیح اور درست ہے یا اس سے کوئی ایسا بہشت مراد ہے۔ جس کا یہاں تشبیہ اور استعارہ (مانگ لینا) کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔اس میں کلام نہیں کہ مسلمان حکما اور عارفین نے اس کو بہت کچھ تشبیہ واستعارہ کے پیرایہ میں رکھ کر حتی المقدور (جہاں تک ہو سکے) مہذبانہ صورت میں پیش کیا ہے۔اور زمانہ حال کی مہذب اور شائستہ اسلامی جماعت کے لئے جو کہ مسیحیوں کی تہذیب اور مغربی تعلیم سے اثر پذیر ہو رہی ہے۔ یہ ایک نہایت ضروری اور طبعی امر ہے کہ اس قسم کی رنگین بیانیوں کو اچھی صورت میں پیش کرے۔ لیکن یہ ماننا کہ حضرت محمد کا یہی مطلب تھا یا ان کے سامعین نے اس وقت یونہی سمجھا بعید از وہم (وہ بات جو خیال میں نہ آسکے) اور نہایت مشکل ہے۔ کیونکہ حضرت محمد کا دل بدرجہ غایت عملی (عملی وجہ) تھا اور اس میں عرفان وتصوف (صوفیوں کا عقیدہ وپہچان) کا نام بھی نہ تھا۔ انتظام دینوی اور انسانی انسداد میں آنحضرت کو کوئی مشکل نظر نہ آتی تھی۔ اور اس قسم کے امور کو آپ کسی صورت میں راز ومعما (پوشیدہ راز) نہ سمجھتے تھے۔ جہنم کے

عذاب کا بیان حرف بہ حرف صحیح اور حقیقی خیال کیا جاتا ہے۔ اور کوئی بھی اس امر کی کوشش نہیں کرتا کہ اس کو تشبیہات واستعاروں کے پیرایہ میں پیش کرے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بہشت کی خوشیوں کے بیان کو ویسا ہی بلا کم وکاست (بغیر کمی بیشی کے) لفظ بلفظ صحیح اور حقیقی قرار نہیں دیا جاتا اور ان کی کئی طرح سے تاویلات کی جاتی ہیں؟ یہ بھی خیال رہے کہ اس شہوت رانی اور نفس پرستی کے بہشت کا آپ نے اس وقت بیان کیا تھا۔ جب آپ صرف ایک ہی بیوی کے ساتھ پرہیزگاری اور پاکیزگی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بعض آپ کی اسی پاکیزہ زندگی کو اس امر کی دلیل (ثبوت) گردانتے (جانتے) ہیں۔ کہ آنحضرت نے جو بہشت پُر از لذائذ نفسانی اور عیش وعشرت سے مملو (بھرا ہوا) بیان کیا۔ وہ محض تشبیہ اور استعارہ کے طور پر تھا لیکن اس مقام پر یہ یاد رہے کہ اگرچہ آپ بی بی خدیجہ کے ساتھ وفاداری کرتے تھے اور اس کے از حد شیفتہ وفریفتہ (عاشق) تھے تو بھی آپ اس کے تابع اور مطیع ومنقاد (فرماں بردار وتابع دار) تھے۔ خدیجہ آپ کی مالک سمجھی جاتی تھی۔ اسی نے آپ کو افلاس (غربت) سے رہا کیا اور ایک خاصے متمول آدمی (دولتمند آدمی) کے رتبہ کو پہنچایا لیکن پھر بھی تمام جائیداد خدیجہ کے اپنے ہی قبضہ وتصرف (اختیار) میں تھی۔ اس عرصہ میں آنحضرت کبھی کسی صورت میں ظاہر نہ کر سکے۔ کہ آپ دیگر زوجات مطہرات یا جہیز وغیرہ کے خواہشمند تھے۔ بعض محققین اور نکتہ رس (تیز فہم) اشخاص کے نزدیک یہ امر اظہر من الشمس (سورج کی طرح ظاہر وعیاں) ہے۔ کہ یہ میانہ روی (درمیانہ راستہ) آنحضرت کے لئے ایک مجبوری امر تھی۔ کیونکہ جب آپ کو موقعہ ملا تو آپ نے خوب ہی دل کھول کر حسرتیں نکالیں۔ روضتہ الاحباب میں لکھا ہے۔ کہ خدیجہ کی وفات پر حضرت محمد نہایت ہی پژمردہ اور شکستہ خاطر تھے۔ کسی دوست نے پوچھا کہ آپ اور نکاح کیوں نہیں کر لیتے؟ آپ نے فرمایا کہ میں کس سے نکاح کروں؟ اس پر اس دوست نے کہا کہ اگر آپ کوئی باکرہ (پاک) اور دوشیزہ لڑکی چاہتے ہیں تو آپ کے دوست ابو بکر کی بیٹی عائشہ موجود ہے۔ اور اگر آپ کسی جوان عورت کو ترجیح دیتے ہوں تو سودہ جو کہ آپ کی معتقد (اعتقاد رکھنے والا) ہے اور آپ پر ایمان لائی ہے حاضر ہے۔ آنحضرت نے اس عقدہ لاینحل (وہ مشکل مسئلہ جو حل نہ ہو) کو یوں حل کیا اور فرمایا کہ ان دونوں سے دریافت کرو کہ آیا وہ مجھ سے نکاح کرنے کو خوش ہیں یا نہیں۔ خدیجہ کی آنکھ بند ہوئے ابھی دو ہی مہینے گزرے تھے کہ آپ نے سودہ سے نکاح کیا اور عائشہ جو اس وقت ابھی چھ برس کی لڑکی تھی اور تین سال کے بعد آپ کی سلک زوجات مطہرات میں منسلک ہوئی نسبت ٹھہر گئی۔ اب یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ بہشت کی ان جسمانی اور نفسانی خوشیوں کی روشن بیانیاں بعد کے زمانہ کی سورتوں میں کیوں نہیں پائی جاتیں؟[19] اس کا ایک یہ سبب بیان کیا جاتا ہے کہ آنحضرت کے مدنی مرید اب ہر طرح ظلم تعدی (ظلم وستم) سے محفوظ تھے۔ اس واسطے کچھ ضرورت نہ تھی کہ اس قسم کے وعدوں سے ان کی ہمت بڑھائی جاتی۔ پر بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ جب آنحضرت نے ہر طرح سے حتی المقدور اپنی نفسانی خواہشوں اور شہوات کو پورا کر لیا تو پھر اس قسم کے بیانات کی حظِ نفس (بدنی خوشی) کے لئے چنداں ضرورت نہ رہی۔ جب آنحضرت کو عیش وعشرت کی دست رس نہ تھی۔ تو آپ کی نظر میں اہل جنت کے لئے بہشت میں حور وغلمان سے بڑھ کر کوئی اچھی جزانہ تھی۔ پر جب بے روک ٹوک حسرتیں نکال چکے تو جس قدر عشقیہ مضمون دماغ میں بھرے ہوئے تھے سب ہوا ہو گئے[20]۔

---

[19] حضرت محمد کی مکہ سے مدینہ کی ہجرت کے بعد تقریباً عرصہ دس سال کی مدنی سورتوں میں اس بات کا صرف دو دفعہ ذکر پایا جاتا ہے کہ حوریں یعنی خوبصورت عورتیں بہشت کی خوشیوں اور عیش وعشرت کا ایک حصّہ ہونگی۔ بعد ازاں ان کو منکوحہ بیویوں کی حیثیت میں بیان کیا ہے اور حرموں کے پیرایہ میں پیش نہیں کیا۔ سورۃ بقرہ کی ۲۳ آیت میں لکھا ہے **وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ** یعنی اور وہاں ہیں ان کے لئے عورتیں ستھری۔ جس نفسانیت اور شہوت پرستی کے بہشت کو مکہ میں اس زور وشور سے پیش کیا جاتا تھا اب مدینہ میں یا تو یہودیوں سے میل ملاپ رکھنے سے آنحضرت پر اس قدر ان کے اخلاق کا اثر ہوا کہ آپ کے خیالات تبدیل ہو گئے یا ڈر گئے یا اس کا باعث یہ ہو سکتا ہے کہ اب مدینہ میں مسلمانوں کو بہشت کی عیش وعشرت کا ذکر سنا کر ان کی ہمت بڑھانے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ سب کچھ حسب خواہش اور ضرورت سے زیادہ اسی دنیا میں حاصل تھا پس انہوں نے ایسے بہشت کی خوشخبری سے کیا خط اٹھانا تھا۔

[20] آسبرن صاحب کی کتاب مسمی بہ اسلام وعہد عرب کا صفحہ نمبر ۳۶ ملاحظہ کیجئے۔

ایامِ مکہ کے دوسرے حصّہ میں دوزخ اور اس کے عذاب کا بیان نہایت ہولناک ہے۔ اہلِ دوزخ ہمیشہ سخت عذاب میں مبتلا رہینگے ان کو سر سے پکڑ کر اور کھینچتے ہوئے دوزخ میں پھینکا جائیگا اور ان کو زبردستی ابلتا ہوا پانی پلایا جائیگا اور آتشی لباس پہنائے جائینگے، لوہے کے گدزوں سے ان کو ماریںگے اور جب وہ چھٹکارے کے لئے بھاگینگے تو ان کو پھر پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دوزخ میں ڈالینگے اور کہینگے **ذوقوا مس سقر** یعنی چکھوں مزا آگ کا۔ پس اسی طرح وہ رہینگے جلانے والی ہوا کے جھونکوں اور کھولتے پانی میں اور دھوئیں کے سایہ میں جو کہ نہ ٹھنڈا ہے اور نہ اس سے کچھ آرام حاصل ہو سکتا ہے۔

پھر ایامِ مکہ کے تیسرے حصّہ میں یہی زجر و عتاب (روک و غصہ) اور ہیبت ناک لعنتیں سنائی گئی ہیں۔ جن سے صاف پتہ لگتا ہے کہ آپ جب تک مکہ میں رہے اپنے مخالفین کے ساتھ اسی قسم کی دھمکیوں سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ سورہ ابراہیم کی ۴۴ اور ۵۱ آیت میں یوں لکھا ہے کہ **مُهْطِعِينَ مُقْنِعِي رُءُوسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَأَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ وَأَنذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُولُ الَّذِينَ ظَلَمُوا رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُم مِّن قَبْلُ مَا لَكُم مِّن زَوَالٍ** یعنی دوڑتے ہونگے اوپر اٹھائے ہوئے اپنے سر۔ پھرتی نہیں اپنی طرف ان کی آنکھیں۔ اور دل ان کے اڑ گئے ہیں۔ اور ڈراوے لوگوں کو اس دن سے کہ آویگا ان کو عذاب تب کہینگے بے انصاف اے رب ہمارے فرصت دے ہم کو تھوڑی مدت۔ اور دیکھ تو گنہگار اس دن جوڑے ہوئے زنجیروں میں۔ کرُتے ان کے ہیں گندھک کے اور ڈھانکے لیتی ہے ان کے منہ کو آگ۔

پھر سورہ مومن کے آٹھویں رکوع میں یوں مرقوم ہے **الَّذِينَ كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُونَ** یعنی جنہوں نے جھٹلائی یہ کتاب[21] اور جو بھیجا ہم نے[22] اپنے رسولوں کے ساتھ سو آخر جان لینگے۔ جب طوق (ہار) پڑے ہیں۔ ان کی گردنوں میں اور زنجیریں۔ گھسیٹے جاتے ہیں جلتے پانی میں۔ پھر آگ میں ان کو جھونکتے ہیں۔ علاوہ اس کے سورہ یونس کے تیسرے رکوع میں اس طرح مندرج ہے۔ **وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ مَّا لَهُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ** یعنی اور جنہوں نے کمائی برائیاں بدلہ برائی کا اس کے برابر ان پر چڑھیگی رسوائی۔ کوئی نہیں انکو اللہ سے بچانے والا۔ جیسے ڈھانک دیا ہے ان کے منہ پر ایک اندھیرا ٹکڑا رات کا۔ یہ دوزخی ہیں سدا اس میں رہینگے۔

واضح رہے کہ حضرت محمد بلا روک بار بار یہی کہتے رہے کہ میں نذیر من اللہ ہوں پر قریش نے ان کی ایک نہ سنی۔ چنانچہ سورہ حجر کے پانچویں رکوع میں لکھا ہے کہ **وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ** یعنی اور کہہ کہ میں وہی ہوں ڈرانے والا کھول کر۔ پھر سورۃ ص کی تیسری آیت میں یوں مرقوم ہے **وَعَجِبُوا أَن جَاءَهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَٰذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ** یعنی اچنبھا کرنے لگے اس پر کے آیا ان کو ڈر سنانے والا انہیں میں سے اور کہنے لگے منکر یہ جادوگر ہے جھوٹا۔

---

[21] قرآن

[22] زمانہ سلف کی کُتب مقدسہ یعنی توریت، زبور اور انجیل شریف

ایسا ہی سورہ یس کی ۵ ویں آیت اور سورہ انبیاء کی ۴۶ ویں آیت میں یوں مرقوم ہے۔ **لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاؤُهُمْ فَهُمْ غَافِلُونَ** ، **قُلْ إِنَّمَا أُنذِرُكُم بِالْوَحْيِ** یعنی تاکہ ڈراوے تو ایک لوگوں کو کہ ڈر نہیں سنا ان کے باپ دادوں نے۔ سو خبر نہیں رکھتے کہہ تو کہ میں تم کو خُدا کے حکم کے موافق ڈر سناتا ہوں۔

یہ تمام سورتیں جن کی آیات اقتباس کی گئی ہیں ایام مکہ کے وسطی زمانہ کی ہیں جبکہ آنحضرت قبیلہ قریش کی مطیع و منقاد بنانے میں سرگرم و مصروف تھے۔ پھر ایک آخری مدنی سورۃ یعنی سورہ فتح کی آٹھویں آیت میں مندرج ہے **إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا** یعنی ہم نے تجھ کو بھیجا احوال بتانے والا اور خوشی اور ڈر سناتا۔ لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ اس ڈر سنانے کا خاص مطلب یہ تھا کہ لوگ اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لائیں۔ جائے غور ہے کہ اس ایمان کی ان اغراض کا بیان عموماً آخری سورتوں میں پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں جب تک آنحضرت تشریف فرما رہے زیادہ حلیم (نرم) تھے۔ سورہ فلق اور سورہ الناس کی نسبت اگرچہ تحقیق معلوم نہیں کہ وہ مکہ میں نازل[23] ہوئیں پر اگر ان کو مکی تسلیم کر لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت اپنی معمولی خوش الحانی کو استعمال کرتے تھے۔ اور اس قدر زمانہ سازی اور توہمات کے بس میں تھے۔ کہ آپ اس بات کا اکثر اظہار کرتے تھے۔ کہ ان کے دشمن اگر ان کو کسی سحری یا تاثیر (اثر) سے ضرر (نقصان) پہنچانا چاہیں تو وہ اس سے مامون و مصون (محفوظ و نگہبان) رہ سکتے تھے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص لبید نامی نے جو کہ یہودی تھا اپنی بیٹیوں کی مدد سے آنحضرت پر جادو کیا اور حضرت جبرائیل نے یہ دونوں سورتیں[24]۔ (فلق والناس) پڑھ کر آپ کو اس کے جادو کی تاثیر (اثر) اور ضرر (نقصان) سے بچایا۔ چنانچہ سورہ فلق اور سورالناس کی عبارت یہ ہے **قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ وَمِن شَرِّ غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ وَمِن شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ** اور **قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ النَّاسِ إِلَٰهِ النَّاسِ مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ** یعنی تو کہہ میں پناہ میں آیا صبح کے رب کی۔ ہر چیز کی بدی سے جو اس نے بنائی اور بدی سے اندھیرے کی جب سمٹ آئے۔ اور بدی سے پھونکنے والی عورتوں کی گرہوں میں۔ اور بدی سے برا چاہنے والوں کی جب لگے ہونسنے۔ تو کہہ میں پناہ میں آیا لوگوں کے رب کی۔ لوگوں کے بادشاہ کی۔ لوگوں کے پوجے ہوئے کی۔ بدی سے اس کی جو سنکارے چھپ جاوے وہ جو خیال ڈالتا ہے لوگوں کے دل میں۔ جنوں یا آدمیوں میں سے۔ ان سورتوں کو سورۃ المعوذتین یعنی حفاظت و نگہبانی کی سورتیں کہتے ہیں۔ اور دفع ضرر آسیب و بلیات (مصیبتوں) کے لئے ان کو لوگ تعویذ کے طور پر کسی چیز پر لکھ کر یا کندہ کر کے پہنتے ہیں۔

---

[23] نولدیکی صاحب فرماتے ہیں کہ ان دونوں سورتوں کے نزول کا وقت مقرر کرنا بہت مشکل ہے اور اس امر کا فیصلہ کرنا کہ یہ حضرت محمد کی مکہ سے مدینہ کی طرف مہاجرت سے پہلے کی ہیں سخت دشوار ہے دیکھو نولدیکی صاحب کا گشختی دس قرآن صفحہ ۸۵۔ پھر مندرج ہے۔ وامانیزعک من الشیطن نزغ فاستعذ باللہ یعنی اور کبھی چوک لگے تجھ کو شیطان کے چوکنے سے تو پناہ پکڑ اللہ کی۔ اور سورہ نحل کی تیرھویں رکوع میں مرقوم ہے۔ **فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ** یعنی جب تو پڑھنے لگے قرآن تو پناہ لے اللہ کی شیطان راندے ہوئے سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورتیں مکی ہیں اور اس وقت سے علاقہ رکھتی ہیں جبکہ حضرت محمد ابھی اہل عرب کے توہمات سے نجات یافتہ نہ تھے۔ بہت سے مسلمان مفسرین کہتے ہیں کہ لبید یہودی مدینہ میں رہتا تھا اس واسطے یہ سورتیں یعنی فلق اور الناس مدنی اور ہجرت کے بعد کی ہیں۔ اس قسم کے بیانات سے ان کے نزول کی کوئی ٹھیک تاریخ مقرر نہیں ہو سکتی۔

[24] دیکھو تفسیر حسینی سورہ فلق۔

باوجود بہشت کی تمام موعودہ عیش وعشرت۔ عذاب جہنم کی دھمکیوں اور سحر وجادو پر غالب ہونے کے بیان اور دعوؤں کے حضرت محمد قبیلہ قریش کو اپنا معتقد (اعتقاد رکھنے والا) نہ بنا سکے۔ اب آنحضرت اپنے غریب مومنین[25] کی حفاظت سے قاصر (مجبور) تھے اور یہ بھی آپ کو گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ کہ ان کو اسلام سے منکر (انکار کرنے والا) اور برگشتہ ہوتے ہوئے دیکھیں۔ اس وقت عرب اور حبش میں تجارتی رشتہ بہت محکم واستوار تھا۔ پس آپ نے اپنے غریب اور مظلوم مومنین کو حکم دیا کہ عرب سے ہجرت کر کے حبش میں چلے جائیں۔ یہ مہاجرین تعداد میں بہت تھوڑے تھے اور انہوں نے اپنے مخالفین کے ظلم وتعدی (ناانصافی) کے باعث اسلام سے منکر ہونے پر جلاوطنی اور غربت کو ترجیح دی۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ فی الحقیقت سچے ایماندار تھے۔

اے بی سینیا میں جا کر ان میں سے بعض مسیحی کلیسا میں داخل ہو گئے۔ کیونکہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں اس وقت ایسی مخالفت نہ تھی۔ جیسی کہ بعد میں ظہور پذیر (ظاہر) ہوئی۔ اور اگر اس کے چند سال بعد خود حضرت محمد بھی مدینہ میں نہ جا رہتے تو شاید اے بی سینیا میں تشریف لے جاتے۔ اور بجائے اسلام کے کسی مسیحی بدعتی فرقہ کے بانی ہوتے۔

چونکہ اب قریش کے ساتھ کچھ صلح کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس لئے جو مسلمان اے بی سینیا کو چلے گئے تھے تین مہینے کے بعد مکہ میں واپس آ گئے۔ سرداران مکہ میں سے ایک شخص مقرر کیا گیا کہ حضرت محمد سے ملاقات کرے۔ اور عہد وپیمان کے باب میں اس کو کسی ڈھنگ پر لائے۔ چنانچہ اس نے آنحضرت کے پاس جا کر یوں کہا کہ اے بھائی آپ جانتے ہیں۔ کہ آپ ہماری قوم میں اعلیٰ رتبہ پر ممتاز ہیں۔ اور آپ نے آج کل ہمارے سامنے ایک نہایت نازک معاملہ پیش کیا ہے۔ جس سے ہماری جماعت کے اجزا متفرق ہو گئے ہیں۔ آپ نے ہم کو بے وقوف اور احمق کے نام سے نامزد کیا۔ ہمارے دین ومذہب کی توہین کی اور ہمارے متوفی (وفات پائے ہوئے) آباؤ اجداد پر کفر وبے ایمانی کا الزام لگایا ہے۔ اب میں آپ سے ایک درخواست کرتا ہوں کہ اگر آپ اس کے نفسِ مضمون پر بخوبی غور کرینگے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائیگا کہ یہ درخواست نہایت معقول (مناسب) اور قابل قبول ہے۔ اب عزت ودولت حضرت محمد کے سامنے پیش کی گئیں اور یہ شرط قرار پائی کہ اگر حضرت محمد قریش کے معبودوں کو تسلیم کریں تو وہ بھی اللہ کو اپنا خُدا مانینگے اور اپنے دیگر معبودوں کی طرح اس کی بھی پرستش کریں گے۔ اس معاملہ میں آنحضرت کے سامنے بڑی بھاری آزمائش تھی[26]۔

حضرت محمد کی یہ تمنا اور آرزو (خواہش) تھی کہ اہلِ مکہ کو مسلمان کرے۔ لیکن صرف چالیس پچاس آدمی ایمان لائے اور اس وقت ان میں سے بھی بعض جلاوطن تھے۔ قبیلہ قریش کے لوگ اب بھی بدستور سابق بالکل مخالف وضدی تھے۔ اور ان میں کسی طرح کی تبدیلی کا تا حال نام ونشان بھی نہ تھا۔ ہر طرح سے مایوسی اور ناامیدی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اور اب مخالف جماعت کی طرف سے دعوے توحید الہٰی کے بارہ میں کسی قدر رضا مندی حاصل کرنے کا موقع تھا۔ چنانچہ یہ قصہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک حضرت محمد کعبہ کے قریب سرداران مکہ کی ایک جماعت کے پاس پہنچے۔ اور ان کی مجلس میں شامل ہو کر اپنے استقلال واستحکام (خیر مقدم ومضبوطی) کے باب میں سورہ نجم سے شروع کی آیات یوں پڑھیں **وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ** قسم ہے تارے کی جب گرے۔ بہکا نہیں تمہارا

---

[25] اس وقت ان تمام غلاموں نے جو خود مسیحی ملکوں سے عرب میں پہنچائے گئے یا جو مکہ میں ان مسیحیوں کی اولاد تھے اسلام قبول کر لیا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ حضرت محمد ایک شخص ہے جو غلامی سے چھڑانے اور مخلصی دینے والا ہے تو وہ اس پر ایمان لائے اور ان کا ایمان ایسا پختہ تھا کہ ان میں سے کئی اسلام کے اقرار پر شہید ہو گئے۔ سورہ علق کی دسویں آیت میں عبداذا صلے (یعنی بندہ کو جب وہ نماز پڑھے) نولدیکی صاحب کے نزدیک انہی غلاموں کی طرف اشارہ ہے لیکن اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "خُدا کا خادم جبکہ وہ نماز پڑھتا ہے۔" اور اس سے بعض کے نزدیک خود محمد صاحب مراد ہیں اور میں اس دھمکی کی طرف اشارہ ہے جو ابوجہل نے آنحضرت کو یہ کہہ کر سنائی تھی کہ جب تو نماز میں مصروف ہو گا میں تیری گردن پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاؤنگا۔ دیکھو نولدیکی صاحب کی کتاب گشختی دس قرآن صفحہ ۱۶۶ اور تفسیر حسینی جلد دوم صفحہ ۴۶۸۔

[26] Muir's life of Muhammad جلد دوم صفحہ ۱۵۰ سے ۱۵۶ تک۔

رفیق (ساتھی) اور بے راہ نہیں چلا۔ اور نہیں بولتا ہے اپنے چاؤ سے۔ یہ تو حکم ہے جو پہنچتا ہے۔ اس کو سکھایا سخت قوتوں والے نے۔ پھر ان رازوں کی طرف اشارہ کر کے جو آپ پر منکشف (ظاہر) کئے گئے۔ آپ نے مکہ کے بتوں کا یوں بیان کیا اور فرمایا کہ **أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ**۔ یعنی بھلا تم دیکھو تو لات و عزیٰ اور منواۃ تیسرا پچھلا۔ بعد ازاں آپ نے قریش کی صلح و یگانگت کا ذکر کیا۔ اس وقت قریش کے لوگ بڑے شوق اور غور کے ساتھ سن رہے تھے اور آپ کی باتوں میں محو ہو رہے تھے۔ ان کی خوشی اور حیرانی کی کچھ حد نہ رہی جب انہوں نے یہ سنا کہ سب بزرگ نام ہیں[27] اور ان کی سفارش کی امید رکھنی چاہئے۔

اس سورت کے آخری الفاظ جیسا کہ حضرت محمد نے پڑھ کر سنائے یہ ہیں۔ **فَاسْجُدُوا لِلَّهِ وَاعْبُدُوا** یعنی سجدہ کرو اللہ کے آگے اور بندگی کرو۔ سب حاضرین نے ایک دل ہو کر خُدا کے حضور سجدہ کیا۔ یہ ایک نہایت دل پسندانہ اور عجیب و غریب نظارہ تھا۔ قریش کے لوگ بہت خوش ہو گئے اور کہنے لگے کہ اب ہم نے جانا کہ صرف خُدا ہی زندہ کرتا اور مارتا ہے اور وہی پیدا کرتا اور برقرار رکھتا ہے۔ یہ ہماری دیویاں اسی کے حضور ہماری سفارش کرتی ہیں اور جب تو نے ان کے لئے ایک درجہ مقرر کر دیا ہم اس سے خوش ہیں۔ تیری پیروی کرنے پر راضی ہیں۔ لیکن باوجود اس سب کے حضرت محمد نے بہت جلد معلوم کر لیا کہ میں نے اس معاملہ میں بہت دھوکہ کھایا اور بڑی غلطی کی ہے اور جس بے حقیقت رتبہ کو میں نے حاصل کیا ہے مجھے فی الفور اس سے دست بردار ہونا چاہئیے۔ حضرت محمد نے دیکھا کہ لوگ بُت پرستی سے باز نہیں آتے۔ اور اس کی صلح اور عہد و پیمان سے دراصل کچھ بھی فائدہ نہیں ہوا۔ احادیث کے بیان کے مطابق اس وقت بذریعہ وحی خُدائے تعالیٰ نے آپ کی یوں تسلی کی کہ پہلے پیغمبروں کو بھی شیطان نے اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے چنانچہ سورہ حج کے ساتویں رکوع آیت ۵۲ میں یوں مندرج ہے[28]۔ **وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ** یعنی اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب خیال باندھتے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں۔ پھر اللہ ہٹاتا ہے شیطان کا ملایا ہوا۔

جب خُدا نے آنحضرت کے اعتماد و وثوق کو اس طرح پھر بحال کر دیا تو ان بتوں کے حق میں جیسا کہ اب قرآن میں مندرج ہے بذریعہ وحی صحیح طور پر آیات نازل ہوئیں **أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم** (سورہ نجم آیت ۱۹ تا ۲۳) یعنی بھلا تم دیکھو تو لات اور عزیٰ اور منوہ تیسرا پچھلا۔ کیا تم کو بیٹے اور اس کو بیٹیاں؟ تو تو یہ بانٹتا بھونڈا۔ یہ سب نام ہیں جو رکھ لئے ہیں تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے۔

---

[27] مسلمان مورخین اور مفسرین یا تو اسکا یوں بیان کرتے ہیں کہ سامعین کے کانوں پر شیطان کی طرف سے کچھ ایسی سحری تاثیر کی گئی کہ انہوں نے یہ الفاظ جو کہ آنحضرت کی زبان سے نہیں نکلے تھے سنے اور یا بیضاوی کی طرح اس قصہ ہی کے صاف انکاری ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مشرکین کی اختراع اور جعلسازی ہے۔ روضۃ الاحباب میں لکھا ہے کہ جب سورہ نجم نازل ہوئی تو سرور عالم کعبہ شریف کی طرف گئے اور مجمع قریش میں اس کو پڑھ کر سنایا پڑھتے وقت آپ ہر آیت پر اس غرض سے ٹھہر جاتے تھے کہ سامعین اچھی طرح سن لیں اور بخوبی یاد رکھ سکیں۔ سب اس مشہور آیت پر پہنچے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ کیا تم دیکھتے ہو لات اور عزیٰ اور منوٰۃ کو جو کہ تیسرا ہے ماسوا پہلے دو کے تو شیطان نے منکرین کے کانوں میں یہ الفاظ پہنچائے کہ یہ مبارک اور بزرگ دیویاں ہیں اور ان کی سفارش کی امید آرزو اور جائیز ہے۔ اس سے کفار خوش ہو گئے۔ دیکھئے کیلی صاحب کی کتاب Muhammad and Muhammadanism صفحہ 281 اور ویری صاحب کی تفسیر قرآن جلد سوم صفحہ ۱۶۷ جہاں کہ اور بہت سی تفسیروں کے حوالے دئے گئے ہیں۔

[28] یہ سورۃ مدنی ہے اور اس میں دور کی گذشتہ کی لغزش کی طرف اشارہ ہے اور تواریخ اسکی صحت کی ایک کافی دلیل ہے۔ سیل صاحب الفاظ اذا تمنیٰ کا ترجمہ جب اس نے پڑھا کرتے ہیں اور راڈویل صاحب کی طرح ان کا ترجمہ یہ نہیں کرتے کہ جس کی خواہشوں یا خیالوں میں۔ تفسیر حسینی میں انکا ترجمہ یوں ہے۔ چوں تلاوت کرد (یعنی جب اس نے پڑھا اور اس ماجرا کی طرف اشارہ کر کے جو مکہ میں گذرا تھا اس کی تشریح کی گئی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے فارسی ترجمہ میں آرزو بخاطر نسبت لکھتا ہے۔ اور تفسیر ابن عباس میں قراۃ الرسول یعنی رسول کا پڑھنا مرقوم ہے اور یہی معنی سب سے عمدہ معلوم ہوتے ہیں اور اس کے لئے کافی دلائل موجود ہیں۔

اب یہ سن کر قبیلہ قریش کے لوگ نہایت ناراض ہوگئے اور کہنے لگے۔ کہ حضرت محمد نے ہماری دیویوں کی نکوئی (راستی) اور خُدا کے حضور ان کی خوبیوں کے باب میں جو کچھ بیان کیا تھا۔ اب اس سے پچھتاتا ہے اور اب اس نے اس بیان کو تبدیل کر لیا ہے۔ پس اس پر قریش نے لوگوں کو برانگیختہ (بھڑکایا ہوا) کیا اور وہ آنحضرت کو تمام مریدوں سمیت سخت ستانے اور اذیت پہنچانے لگے۔ اس معاملہ میں حضرت محمد نے خواہ کتنی ہی کمزوی ظاہر کی ہو۔ تاہم اس وقت سے ہمیشہ کے لئے بُت پرستی سے بوجہ اتم دست بردار ہوگئے۔ اور بُت پرستوں کی سزا و عقوبت (عذاب) کا علانیہ بیان کرنے لگے۔ چنانچہ سورہ الصفت کے تیسرے رکوع میں مندرج ہے **أَتَعْبُدُونَ مَا تَنْحِتُونَ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَسْفَلِينَ** یعنی کیوں پوجتے ہو جو آپ تراشتے ہو اور اللہ نے بنایا تم کو اور جو بناتے ہو۔ پھر چاہنے لگے اس پر بُرا داؤ۔ پھر ہم نے ڈالا انہیں کو نیچے۔ بُت پرستی سے خُدا تعالیٰ کی ناراضگی کے ثبوت میں حضرت موسیٰ ایک گواہ کے طور پر بنی اسرائیل کو سورہ طٰہٰ کے پانچویں رکوع میں یوں کہتا ہوا پیش کیا جاتا ہے ترجمہ: دیکھ اپنے ٹھاکر کو جس پر سارے دن لگا بیٹھا تھا ہم اس کو جلا دینگے۔

اس لغزش (غلطی) کے تھوڑی دیر بعد آنحضرت کو بذریعہ وحی آگاہی ملی کہ آئندہ اس قسم کے عہد و پیمان سے دور رہیں۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل کے ۸ویں رکوع میں مرقوم ہے۔ **وَإِن كَادُوا لَيَفْتِنُونَكَ عَنِ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهُ وَإِذًا لَّاتَّخَذُوكَ خَلِيلًا وَلَوْلَا أَن ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ كِدتَّ تَرْكَنُ إِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيلًا** یعنی اور وہ تو لگے تھے کہ تجھ کو پچھلا دیں اس چیز سے جو وحی بھیجی ہم نے تیری طرف۔ تا باندھ لاوے تو اس کے سوا اور تب پکڑتے تجھ کو دوست۔ اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو ٹھہرا رکھا تو تو لگ ہی جاتا جھکنے ان کی طرف تھوڑا سا[29]۔

بُتوں کی سفارش کی بے ہودگی اور اس امر کے معتقدوں کے واہیات خیالات کا بیان سورہ فاطر کے پانچویں رکوع میں یوں مندرج ہے **قُلْ أَرَأَيْتُمْ شُرَكَاءَكُمُ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمَاوَاتِ أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا فَهُمْ عَلَى بَيِّنَةٍ مِّنْهُ بَلْ إِن يَعِدُ الظَّالِمُونَ بَعْضُهُم بَعْضًا إِلَّا غُرُورًا** یعنی تو کہہ بھلا دیکھو اپنے شریک جن کو پکارتے ہو اللہ کے سوا۔ دکھاؤ تو مجھ کو کیا بنایا انہوں نے زمین میں یا ان کی کچھ شراکت ہے آسمانوں میں یا ہم نے دی ہے اُن کو کوئی کتاب سو یہ سند رکھتے ہیں اس کی۔ کوئی نہیں پر جو وعدہ بتاتے ہیں گنہگار ایک دوسرے کو سب فریب ہیں۔ اس طرح سے اہلِ مکہ کو بُت پرستی کی جہالت سے متنبہ (آگاہ) کیا گیا۔ جس ماجرے سے یہ تمام نتائج ظہور پذیر ہوئے اسی پر آنحضرت کی آئندہ زندگی کا ظلم و تشدد مبنی تھا۔

اب حضرت محمد اس پستی کی حالت سے پھر جلد اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے مریدوں میں پھر اسی دھوم دھام اور استحکام کے ساتھ اپنا سکہ جمایا پر عوام الناس کے خیالات اس موقعہ پر اور ہی تھے۔ وہ نہ تو اس کے قائل تھے کہ جس شیطانی اثر کا قرآن ذکر کرتا ہے اس کے باعث آپ نے لغزش (خطا) کھائی ہے۔ اور نہ یہ مانتے تھے کہ اس کی تصدیق اس طرح علانیہ طور پر وحی کے وسیلہ سے ہوئی۔ اگر فی الحقیقت قرآن خُدا کا کلام تھا تو یہ تنسیخ

---

[29] بعض علما کا گمان ہے کہ یہ اس آزمائش کی طرف اشارہ ہے جو ساکنان طائف کی طرف سے آنحضرت کو پیش آئی جبکہ آپ کی درخواست و بلاہٹ کے جواب میں انہوں نے چند حقوق طلب کئے مثلاً یہ کہ خیرات وزکواۃ سے بری ہیں مقررہ وقتوں کی نمازوں سے معذور رکھے جاویں اور کچھ عرصہ کے لئے ان کے معبود بت لات کو قائم رکھا جاوے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے اس وقت کی طرف اشارہ ہو جبکہ طائف کا محاصرہ کیا گیا تھا۔ پر اس صورت میں اس کا تعلق ۸ تا ۹ ہجری سے ہوگا اور یہ سورۃ مکی ٹھہریگی۔ تفسیر حسینی میں لکھا ہے کہ اس سے وہ وقت مراد ہے جب قریش نے آنحضرت سے کہا تھا کہ جب تک آپ ہمارے بتوں کو خواہ اپنی سر انگشت سے ہی عزت کی راہ سے نہ چھوئیں آپ کو حجر اسود کے بوسہ کی اجازت نہیں دینگے اس وقت چونکہ سرور عالم کے دل میں طواف کعبہ کا از حد شوق تھا آپ نے سوچا کہ اگر میں اس قدر کروں تو اس سے کیا خرابی متصور ہو سکتی ہے۔ چنانچہ تفسیر حسینی کی عبارت یہ ہے کہ قریش بآنحضرت گفتند کہ نیگذاریم ترا کہ استلام حجر کنی تاوقتیکہ مس کنی بتان اور ما را اگرچہ بسر انگشت باشد آنحضرت کہ غایت شوق بطواف حرم داشت در خاطر مبارک خطور کرد چہ شود اگرچہ چینس کنم۔ میور صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں اس ادبار و زوال کی طرف اشارہ ہے جو مکہ میں واقع ہوا اور جس کا اوپر بیان ہو چکا ہے۔

وتردید (منسوخ ورد کرنا) اور ادل بدل ہر گز ہر گز کلام اللہ نہیں ہو سکتا۔ پس حضرت محمد کی تمام کوششیں جن سے آپ ان کو بُت پرستی سے دست بردار کرنا چاہتے تھے ان پر وہ بہت ہنستے اور مضحکہ اڑاتے تھے۔ جب آنحضرت پر یہ الزام لگا کہ آپ نے آیت تبدیل کر لی ہے تو اس کے جواب میں آپ نے ایک اور آیت پڑھ سنائی جو کہ اسلامی تعلیم ناسخ و منسوخ کی بنیاد ہے۔ چنانچہ سورہ نحل کے ۱۴ رکوع کی پہلی آیت میں یوں مرقوم ہے **وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَاللهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُواْ إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لاَ يَعْلَمُونَ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ** یعنی اور جب ہم بدلتے ہیں ایک کی جگہ دوسری۔ اور اللہ بہتر جانتا ہے جو اتارتا ہے۔ کہتے ہیں تو تو بنالایا ہے۔ یوں نہیں پر ان بہتوں کو خبر نہیں تو کہہ اس کو اتارا ہے پاک فرشتے نے تیرے رب کی طرف سے تحقیق۔

اب بھی قریش کے لوگ آپ پر ہنستے اور ٹھٹھا مار کر یوں کہتے تھے۔ کہ دیکھو وہ شخص ہے جس کو خُدا نے رسول مقرر کر کے بھیجا ہے اگر ہم صبر و استقلال کے ساتھ قائم نہ رہتے۔ تو اس نے ہم کو ہمارے معبودوں سے برگشتہ کرنے میں کسی طرح کا کوئی دقیقہ (باریکی، خفیف معاملہ) باقی نہیں رکھا۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر آنحضرت کے سر پر ابو طالب جیسے صاحبِ قدرت آدمی کی حمایت کا سایہ نہ ہوتا تو اس وقت آپ نہایت خطرہ میں تھے۔ لیکن اس عم (چچا) مہربان اور شفیق (مہربان) حامی نے باوجود اس کے کہ اپنے بھتیجے کی کارروائیوں سے خوش نہ تھا۔ کسی حالت میں اسکا ساتھ نہ چھوڑا۔ اور ہمیشہ مردانہ وار نہایت جوانمردی کے ساتھ اس کی حمایت و حفاظت کرتا رہا۔ ایک دفعہ مخالفین کی مخالفت یہاں تک بڑھ گئی کہ آنحضرت کے ہلاک کئے جانے کا شبہ پڑا۔ بعد میں جب ابو طالب کو خبر ہوئی تو اس نے انہیں بہت دھمکایا اور کہا کہ خُدا کی قسم اگر تم محمد کو قتل کر دیتے تو میں تم سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔

شہر مکہ میں حضرت محمد کی اس وقت جو حالت تھی اس کا بیان یوں ہو سکتا ہے۔ کہ قبیلہ قریش کے لوگ پہلے کی نسبت اب آپ کے زیادہ مخالف تھے اور آپ کے مومنین بیدل اور بے ہمت ہو رہے تھے۔ عوام الناس یا تو آپ سے متنفر (نفرت کرنے والے) تھے یا ان کو کچھ پرواہی نہ تھی پر آپ اپنے چچا ابو طالب کے رعب داب کے باعث ہر طرح کے مخاطر و مخافت (ڈر و خوف) سے محفوظ و مامون (بے خوف) تھے۔ ان تمام نامساعد و نا موافق حالات کے مقابلہ میں آپ نے دو قسم کے دلائل پیش کرنے شروع کئے۔ پس پہلے آنحضرت نے وحی آسمانی کو پیش کیا اور اس سے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی کہ زمانہ قدیم میں بھی پیغمبروں پر ایسی مصیبتیں وارد ہوتی رہی ہیں اور اسی کو آپ نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی ایک صاف دلیل گردانا۔ چنانچہ سورہ حجر کی دسویں آیت سے یوں مرقوم ہے **وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِي شِيَعِ الاوّلِينَ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلاَّ كَانُواْ بِهِ يَسْتَهْزِؤُونَ كَذَلِكَ نَسْلُكُهُ فِي قُلُوبِ الْمُجْرِمِينَ لاَ يُؤْمِنُونَ بِهِ** یعنی اور ہم بھیج چکے ہیں رسول تجھ سے پہلے کئی فرقوں میں اگلے۔ اور نہیں آیا پاس کوئی رسول مگر کرتے رہے اس سے ہنسی۔ اسی طرح پیٹھاتے ہیں اس کو دل میں گنہگاروں کے۔ یقین نہ لاوینگے اس پر دوسری دلیل میں آپ بار بار اپنی الہیٰ بلاہٹ اور وحی کی سچائی اور صداقت کو پیش کرتے رہے۔ یہ زمانہ خصوصاً اس لئے بھی کہ آپ اپنے دعاوی کے منکروں کے حق میں نہایت سخت گوئی کو کام میں لاتے رہے اور از حد غور کے لائق اور قابلِ توجہ ہے۔

ذیل کی آیات میں زمانہ قدیم کے پیغمبروں کے ساتھ جو کچھ بد سلوکیوں کے بیان مندرج ہیں انہی کو آنحضرت نے اپنے پیغمبری اور رسالت کی دلیل (ثبوت، گواہی) قرار دیا ہے۔ سورہ ص کی ۱۱ آیت میں ہے **كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ** یعنی جھٹلا چکے ہیں ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور فرعون میخوں والا۔

اگرچہ سورۃالانبیاء کی آٹھویں آیت مدنی خیال کی جاتی ہے۔پر یہ سورۃایام مکہ کے وسطی زمانہ کی ہے۔اوراس میں اہل مکہ کوان شہروں کا حوالہ دے کر جن پر سابق الایام میں خُداتعالیٰ کا غضب نازل ہوااس امر سے متنبہ(خبردار)وآگاہ کیا گیاہے۔کہ ان کا شہر بڑے خطرہ میں ہے۔چنانچہ ١١آیت میں لکھاہے

**وَكَمْ قَصَمْنَا مِن قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَأَنشَأْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا آخَرِينَ** ترجمہ:اور کتنی توڑماریں ہم نے بستیاں جو تھیں گنہگاراوراٹھا کھڑے کئے ان کے پیچھے اور لوگ۔پھر ٢١آیت میں ان کے معبودوں کی نسبت لکھاہے۔**أَمِ اتَّخَذُوا آلِهَةً مِّنَ الْأَرْضِ هُمْ يُنشِرُونَ** یعنی کیا مقرر کئے ہیں انہوں نے معبودوزمین میں سے کہ وہ اٹھاکھڑا کرینگے۔پھرذراآگے چل کر یوں مندرج ہے **أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ هَذَا ذِكْرُ مَن مَّعِيَ وَذِكْرُ مَن قَبْلِي** یعنی کیا پکڑے انہوں نے اس سے ورے اور صاحب۔تو کہہ لاؤاپنی سند یہی بات ہے میرے ساتھ والوں کی اور مجھ سے پہلوں کی۔

اب آنحضرت نے سلف کے پیغبروں اور بزرگوں کے حوالے دینے شروع کئے اور زکریاہ کے زمانہ تک بیان کیاکہ کس طرح خُداتعالیٰ نے ان کی محافظت اور نگہبانی کی۔نیز آپ نے یہ بھی بیان کیاکہ کس قدر خُداتعالیٰ نے کنواری مریم پراپنافضل کیااور کس پاکیزہ اور معجزانہ طورپر یسوع مسیح[30] اس کے رحم میں آئے۔پس جس طرح یہ تمام بزرگان سلف مقبول الہیٰ تھے اسی طرح اب آپ نے اپنے آپ کوالانبیاء اور مورد عنایت الہیٰ قرار دیا۔جس طرح انکی تحقیر(بے قدری)کی گئی تھی۔اسی صورت میں آنحضرت نے اپنے آپ کوان کا مثیل بیان کیا۔اور مماثلت کے ثبوت میں آپ نے اس مخالفت کا بیان پیش کیاجو کہ زمانہ قدیم کے انبیاء کو پیش آئی تھی۔چنانچہ سورہ قمر کی تیسری آیت میں یوں مرقوم ہے **وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءهُمْ** ترجمہ:یعنی اور جھٹلایا انہوں نے اور چلے اپنے چاؤں پر۔

حضرت نوح کی قوم نے اسکو مفتری(فریبی)کا خطاب دے کر رد کیا۔اور قوم لوط نے حضرت لوط کی تمام وعظ ونصیحت کو دروغگوئی(جھوٹ بولنا)اور لغو بیانی(بکواس)سے منسوب کیا۔اور جب قوم فرعون کو غضب الہیٰ سے آگاہ کیا گیا۔توانہوں نے تمام معجزات کو دھوکہ اور شعبدہ بازی بتایا۔اب حضرت محمد ساکنان مکہ کی طرف متوجہ ہوئے۔اوراسی سورہ کے تیسرے رکوع میں یوں فرمایا **أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُوْلَئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءةٌ فِي الزُّبُرِ** یعنی اب تم میں جو منکر ہیں۔کیاوہ بہتر ہیں ان سب سے یاتم کو فارخطی(بے باقی کی رسید)لکھی گئی ورقوں میں؟چکھو مزاآگ کا۔سورہ شعراء میں مذکور ہے کہ

---

[30] والتی احضت فرجھا فنفخنا فیھا من روحنا وجعلنا وابنھا ایة للعمین ترجمہ:اور وہ عورت جس نے قید میں رکھی اپنی شہوت۔پھر پھونک دی ہم نے اس عورت میں اپنی جان روح اور کیااس کواوراس کے بیٹے کو نمونہ تمام عالم کے لئے سورۃ(النبیاء رکوع ٦) **وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا فَاتَّخَذَتْ مِن دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا قَالَتْ إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَن مِنكَ إِن كُنتَ تَقِيًّا قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا** ترجمہ:اور مذکور کر کتاب میں مریم کاجب کنارے ہوئی اپنے لوگوں سے ایک شرقی مکان میں پھر پکڑ لیاان سے درے ایک پردہ پھر بھیجاہم نے اس پاس اپنافرشتہ پھر بن آیااس کے آگے آدمی پورا۔بولی مجھ کو رحمان کی پناہ تجھ سے اگر توڈر رکھتاہے۔بولا میں تو بھیجاہوں تیرے رب کاکہ دے جاؤں تجھ کو ایک لڑکا ستھرااور سورہ مریم ٦ تا١٩ آیت تک)

مذکور بالا بیان سے یہ معلوم ہوتاہے کہ روح نے انسانی صورت اختیار کی اور سورہ انعام کی نویں آیت **وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنَاهُ رَجُلاً وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِم مَّا يَلْبِسُونَ** یعنی اوراگر ہم رسول کرتے کوئی فرشتہ تووہ بھی صورت ایک مرد کرتے اوران پر شبہ ڈالتے وہی شبہ جو لاتے ہیں وغیرہ سے معلوم ہوتاہے کہ اگر کوئی فرشتہ بھی مرسل من اللہ ہو کر آتاتووہ بھی ضرور انسانی صورت اختیار کرتاپس اس لئے کہتے ہیں کہ جس کے مریم کے پاس جانے کاذکر ہے وہ ضرور جبرائیل فرشتہ تھاپھر سورہ اعراف جوآخری زمانہ کی ایک سورت ہے اس کے ٢٤ویں رکوع اور آیت ١٩٠ میں اس بات کاصاف بیان ہے کہ یہ ہے سیدنا عیسیٰ مسیح ایک نیک اور صالح لڑکا پیداہوا تھاچنانچہ لکھاہے کہ **فَلَمَّا آتَاهُمَا صَالِحاً جَعَلاَ لَهُ شُرَكَاء فِيمَا آتَاهُمَا فَتَعَالَى اللّهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ** یعنی پھر جب دیاان کو چنگا بھلا ٹھہرانے لگے اس کے شریک اس کی بخشی چیز میں سو اللہ بلند ہے ان کے شریک بتانے سے۔سیدنا عیسیٰ مسیح کی پاکیزگی اور معجزانہ پیدائش کا بیان سورہ آل عمران کے چھٹے رکوع میں یو مندرج ہے یعنی تحقیق عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی مثال کی سے ہے۔بنایااس کو مٹی سے۔پھر کہااس کو ہو جا۔وہ ہو گیا۔مطلب یہ ہے کہ خُدانے آدم اور عیسیٰ دونوں کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔

حضرت موسیٰ، نوح، لوط اور دیگر انبیاء کی کس قدر تحقیر (بے عزتی) کی گئی اور ان میں سے ہر ایک پر مفتری (فریبی) اور کذاب (نہایت جھوٹا) کا الزام لگایا گیا۔ یہ قصے نہایت طویل ہیں اور ان سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اہل مکہ نے جو آنحضرت کی مخالفت کی اس سے انبیاء سلف کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہی ثابت ہے۔ کہ اس قسم کی تکالیف اور مخالفت کا پیش آنا سچے پیغمبر کے لئے از بس ضروری اور لابدی (یقینی) امر ہے لیکن اس سے اہل مکہ کی اصل روش کا ٹھیک پتہ نہیں لگتا۔ کیونکہ سورہ شعراء کے ۱۱ رکوع میں ان کو سخت سرزنش (ملامت) کی گئی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے **هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ** یعنی کیا میں بتاؤں تم کو کس پر اترتے ہیں شیطان۔ اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار پر۔ پھر سورۃ الانبیاء کے تیسرے رکوع میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ تمام اس استہزائی (ہنسی، مذاق) مزاج کے لوگوں اور تحقیر کرنے والوں کو لازم ہے۔ کہ جن لوگوں پر زمانہ قدیم میں خُدائے تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ان کے حال پر نظر کر کے عبرت (نصیحت) حاصل کریں۔ کیونکہ ایک وقت آئیگا جب ان کو معلوم ہو جائیگا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ **لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَن ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ بَلْ تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِؤُونَ** ترجمہ کبھی جانیں یہ ہے منکر اس وقت کو نہ روک سکینگے اپنے منہ سے آگ۔ اور نہ اپنی پیٹھ سے اور نہ ان کو مدد پہنچیگی۔ کوئی نہیں وہ آوے گی ان پر بے خبر پھر ان کے ہوش کھو دیگی۔ پھر نہ سکینگے کہ اس کو پھر دیں نہ ان کو فرصت ملیگی۔ اور ٹھٹھے ہو چکے ہیں کتنے رسولوں کے ساتھ تجھ سے پہلے۔ پھر الٹ پڑی ٹھٹھے والوں پر ان میں سے جس چیز کا ٹھٹھا کرتے تھے۔

سورہ والصفت اس زمانہ کی معلوم ہوتی ہے جبکہ آنحضرت کی مخالفت بہت شد و مد (زور و شور) سے نہ ہوتی تھی بلکہ حقیقی دشمنی اور عداوت کی جگہ ایک گونہ نااتفاقی اور بے پروائی پائی جاتی تھی۔ اس صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل مکہ میں سے منکرین نے کس طرح ان لوگوں کی قدم قدم پر تقلید و پیروی کی۔ جنہوں نے زمانہ قدیم میں حضرت نوح، موسیٰ، ہارون، الیاس، لوط اور یونس کو جھٹلایا اور رد کیا تھا۔ اور تمام قصے کسی قدر طوالت (درازی) کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اہل مکہ اپنی بریت (آزادی) کے باب میں یوں عذر (بہانہ) کرتے تھے **لَوْ أَنَّ عِندَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْأَوَّلِينَ لَكُنَّا عِبَادَ اللَّهِ الْمُخْلَصِينَ** یعنی اگر ہم پاس احوال ہوتا پہلے لوگوں کا تو ہم اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے (آیت ۱۶۸ تا ۱۶۹)۔

آنحضرت کو ارشاد ہوا کہ کفارہ سے الگ ہو جاویں کیونکہ ان پر عنقریب ہی عذاب نازل ہونے والا تھا چنانچہ لکھا تھا ہے **وَأَبْصِرْ فَسَوْفَ يُبْصِرُونَ** ترجمہ اور پھر آان سے ایک وقت تک اور دیکھتا رہ۔ اب آگے دیکھ لینگے (آیت ۱۷۹)۔

پھر سورہ مومن آخری زمانہ کی مکی سورتوں میں سے ہے اور اس کا نفسِ مضمون اور طرز بیان بھی سورہ الصفت کا سا ہے بلکہ یہاں تک کہ اس میں کفارہ کے لئے توبہ کا بھی موقع نہیں۔ اس کی آخری تین آیتوں میں یوں بیان کیا گیا ہے **فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَاتِ فَرِحُوا بِمَا عِندَهُم مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِؤُونَ فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا سُنَّتَ اللَّهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ فِي عِبَادِهِ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكَافِرُونَ** یعنی پھر جب پہنچے ان پاس رسول ان کے کھلی نشانیاں لے کر۔ پھر جب دیکھی انہوں نے ہماری آفت بولے ہم یقین لائے اللہ اکیلے پر اور چھوڑیں جو چیزیں شریک بتاتے تھے۔ پھر نہ ہوا کہ کام آوے ان کو یقین لانا ان کا جس وقت دیکھ چکے ہمارا عذاب۔ رسم پڑی ہوئی اللہ کی جو چلی آئی ہے اس کے بندوں میں اور خراب ہوئے اس جگہ منکر (انکار کرنے والے)۔

سورہ صٓ ایامِ مکہ کے وسطی زمانہ کی ایک نہایت مشہور سورت ہے۔اس کی پہلی دس آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں۔ جبکہ قریش نے ابو طالب سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ آنحضرت کی مدد وحمایت سے دست بردار ہو جائے۔اور ابو طالب نے ایسا کرنے سے صاف انکار کیا تھا۔قریش نے ایک دفعہ تو غالباً ۶۱۵ھ میں یہ درخواست کی تھی اور بعض حدیثوں میں یوں مندرج ہے کہ جب ۶۲۰ھ میں ابو طالب بسترِ مرگ (مرنے کے قریب) پر پڑا تھا اس وقت اس سے یہ درخواست کی گئی تھی پر زیادہ تر احتمال (شک وشبہ) یہی ہے۔کہ قریش نے یہ درخواست ۶۱۵ھ میں کی تھی۔اس صورت میں قریش کی پہلی امتوں پر جو جو عذاب نازل ہوئے تھے ان کا حال سنا کر نہایت سختی سے متنبہ (خبر دار) کیا گیا ہے چنانچہ پہلی سات آیات میں یوں مرقوم ہے **ص وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ بَلِ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي عِزَّةٍ وَشِقَاقٍ كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم مِّن قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِينَ مَنَاصٍ وَعَجِبُوا أَن جَاءهُم مُّنذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْكَافِرُونَ هَذَا سَاحِرٌ كَذَّابٌ أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلَهًا وَاحِدًا إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ وَانطَلَقَ الْمَلَأُ مِنْهُمْ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَى آلِهَتِكُمْ إِنَّ هَذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ مَا سَمِعْنَا بِهَذَا فِي الْمِلَّةِ الْآخِرَةِ إِنْ هَذَا إِلَّا اخْتِلَاقٌ أَأُنزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِن بَيْنِنَا بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ مِّن ذِكْرِي بَل لَّمَّا يَذُوقُوا عَذَابِ** قسم ہے اس قرآن کے سمجھانے والے کی۔بلکہ جو لوگ منکر ہیں۔غرور میں ہیں اور مقابلہ میں بہت کھپادیں ہم نے ان سے پہلے سنگتیں۔پھر لگے پکارنے اور وقت نہ رہا خلاصی کا۔اور اچنبھا کرنے لگے اس پر کہ ان کو ایک ڈر سنانے والا نہیں میں سے۔اور لگے کہنے منکر یہ جادو گر ہے جھوٹا۔کیا اس نے کردی اتنوں کی بندگی کے بدلے ایک ہی کی بندگی ؟ یہ ہے بڑی تعجب کی بات اور چل کھڑے ہوئے کتنے پنچ ان میں سے کہ چلو اور ٹھہرے رہو اپنے ٹھاکروں پر۔بیشک اس بات میں کچھ غرض ہے۔یہ نہیں سنا ہم نے اس پچھلے دین میں[31] اور کچھ نہیں یہ بنائی بات ہے۔کیا اسی پر اتری سمجھوتی ہم سب میں سے ؟ کوئی نہیں۔ان کو دھوکہ ہے میری نصیحت میں۔کوئی نہیں۔ابھی چکھی نہیں میری مار۔

ایامِ مکہ کے وسطی زمانہ کے وحی والہام کا اظہار قرآن کے متواتر نازل ہوتے رہنے سے بہت توضیح (وضاحت) کے ساتھ کیا گیا ہے۔قرآن کی تعظیم وتکریم (عزت) کے باب میں بھی آیات نازل ہوئیں۔چنانچہ اس کو مبارک کتاب۔روشن کتاب اور قرآن مجید وغیرہ ناموں سے نامزد کیا گیا ہے۔یہ بھی لکھا ہے کہ کتاب خُدا کی طرف سے ہے اور خُدا نے اس کو عرش معلیٰ (آسمان) سے نازل فرمایا اور سب کتابوں پر فوق (سبقت، برتری) دیا ہے۔چنانچہ سورہ صٓ کی **كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْأَلْبَابِ** یعنی ایک کتاب ہے جو اتاری ہم نے تیری طرف برکت کی تا دھیان کریں لوگ اس کی باتیں اور سمجھیں عقل والے۔

اس موقعہ پر حضرت محمد کو یہ بھی ارشاد ہوا کہ آپ سامعین کی سخت دلی پر غم نہ کھایں اور یہ بھی اطمینان دلایا گیا کہ آپ کی رسالت سچ مچ من جانب اللہ ہے۔اور اس کتاب منیر یعنی قرآن کے نشانات سورۃ شعراء کی دوسری آیت سے پانچویں آیت تک اس طرح مندرج ہیں **لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ إِن نَّشَأْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِم مِّن السَّمَاء آيَةً فَظَلَّتْ أَعْنَاقُهُمْ لَهَا خَاضِعِينَ وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنبَاء مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُون** یعنی شاید تو گھونٹ مارے اپنی جان اس پر کہ وہ یقین نہیں کرتے۔اگر ہم چاہیں اُتاریں ان پر آسمان سے ایک نشانی۔پھر رہ جائیں ان کی گردنیں اس کے آگے نیچی اور نہیں پہنچی ان پاس کوئی

---

[31] حضرت محمد ما سمعیا بھذا افی اللمتہ الاخرۃ کو اس ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ مشرکین کا قول ہے اور طنزاً اس سے آپ کی مراد یہ ہے کہ مسیحی دین بجائے توحید کے تثلیث کی تعلیم دیتا ہے۔ تفسیر حسینی میں لکھا ہے کہ اس سے مسیحی مذہب کے لوگ مراد ہیں جو کہ آخری دین کے لوگ نہیں اور بلا تحقیق ناراستی سے ان کی نسبت کہا گیا ہے کہ وہ تثلیث کے قائل اور توحید کے منکر ہیں چنانچہ لکھا ہے کہ ملت عیسیٰ کہ آخرین مت است چہ ایشاں تثلیث قائل اند نہ بتوحید۔ابن عباس بھی تفسیر حسینی کے بیان سے متفق ہے پر مجاہد کہتا ہے کہ اس سے قریشی مذہب مراد ہے خلاصہ التفاسیر جلد چہارم صفحہ ۴۴۔

نصیحت رحمان سے نئی جس سے منہ نہیں موڑتے۔ سو یہ جھٹلا چکے۔ اب پہنچیگی ان پر حقیقت اس بات کی جس پر ٹھٹھا کرتے تھے۔ پھر اس سورۃ کے گیارہویں رکوع کی چند آیات میں اس امر پر بہت زور دیا گیا ہے۔ کہ قرآن حضرت جبرائیل کی معرفت آسمان سے نازل ہوا۔

لیکن چونکہ ان آیات میں کچھ یہودیوں کا حال مندرج ہے جلال الدین السیوطی کے نزدیک اس سورۃ کا یہ حصّہ مدینہ سے علاقہ (تعلق) رکھتا ہے اور اس لئے ان آیات کو اس جگہ اقتباس کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ لیکن اس سورت کے دیگر چند مقامات میں زمانہ قدیم کے پانچ نبیوں کو یہ کہتے ہوئے پیش کیا ہے کہ خُدا سے ڈرو اور میری تابعداری کرو۔ اور اس سے نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اسی طرح قریش پر فرض ہے۔ کہ حضرت محمد کی اطاعت وفرمانبرداری کریں اور اگر نافرمانی اور سرکشی سے باز نہیں آئینگے۔ تو اس نافرمانی کی سزا پاؤگے۔ پس جب وہ آنحضرت کی اطاعت (تابعداری) نہ کریں تو آپ خُدا کی طرف سے ان کو یوں کہہ سکتے تھے۔ **إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ** ترجمہ "میں الگ ہوں تمہارے کام سے (آیت ۲۱۶) مخالفین آنحضرت پر یہ الزام بھی لگاتے تھے کہ آپ قرآن کی آیات خود بنا کر سناتے ہیں اور یہ من جانب اللہ نہیں ہے۔ اس کے جواب میں آپ نے سورہ طور سے قرآن کی طرز بیان اور اس کے فوق العادت (عادت سے بڑھ کر) مضامین کو بطور معجزہ پیش کیا۔ اور خُدا کی طرف سے ارشاد پاکر فرمایا **أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ** یعنی یا کہتے ہیں یہ بات بنالایا ہے۔ کوئی نہیں پر ان کو یقین نہیں۔ پھر چاہئے لے آویں کوئی بات اسی طرح کی اگر وہ سچے ہیں (دوسرا رکوع) **وَإِنَّ لِلَّذِينَ ظَلَمُوا عَذَابًا** یعنی تحقیق ان لوگوں کے لئے جو گنہگار ہیں مار ہے۔ (آیت ۴۷)۔

سورۃ الحاقۃ ابتدائی زمانہ کی مکی سورت ہے اور ہر طرح کی بناوٹ اختلاق سے قرآن کو بری اور محفوظ ٹھہرانے میں اس سورت میں بہت زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ ۳۸ویں آیت سے ۴۷ویں آیت تک یوں مرقوم ہے۔ **فَلَا أُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُونَ وَمَا لَا تُبْصِرُونَ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُؤْمِنُونَ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ تَنزِيلٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ فَمَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ** یعنی سو قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جو دیکھتے اور ان چیزوں کی جو تم نہیں دیکھتے۔ یہ کہا ہے کہ ایک پیغام لانے والا سردار کا اور نہیں یہ کہا کہ کسی شاعر کا[32]۔ تم تھوڑا یقین کرتے ہو۔ اور نہ کہا پریوں والے کا۔ تم تھوڑا دھیان کرتے ہو۔ یہ اتارا ہے جہان کے رب کا اور اگر یہ بنالاتا ہم پر کوئی بات تو ہم پکڑتے اس کا دہنا ہاتھ۔ پھر کاٹ ڈالتے ہم اس سے رگ گردن کی۔ پھر تم میں کوئی نہیں اس سے روکنے والا۔

یا یوں کہیں کہ لفظ ہم جس کا مفہوم مندرجہ بالا عبارت میں خُدا ہے۔ اس کے استعمال سے خاص غرض یہ تھی کہ منکرین پر ایسا رعب چھا جاوے۔ کہ وہ آنحضرت کو تکلیف دینے اور اذیت پہنچانے سے باز آجائیں۔ اس وقت اہلِ مکہ میں یہ عام خیال تھا کہ آنحضرت پر قرآن خُدا کی طرف سے نازل نہ ہوا تھا۔ بلکہ آپ کی اپنی شاعرانہ لیاقت (قابلیت) کا اظہار و نتیجہ تھا۔ اس خیال سے بریت (نجات) حاصل کرنے کے لئے حضرت از حد متفکر و متردد (فکر مند و پریشان) تھے چنانچہ متذکرہ بالا سورت میں آپ نے خُدا کی طرف سے یوں علان کیا کہ یہ جو الزام آنحضرت پر لگایا جاتا ہے سچ

---

[32] جو شاعر آنحضرت کے برخلاف لکھا کرتے تھے انکو آپ نے دیوانے اور جنوں زدہ بیان کیا چنانچہ سورہ الشعراء کے گیارہویں رکوع میں **وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ** یعنی اور شاعروں کی بات پر چلے وہی جو گمراہ ہیں تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں سرمارتے پھرتے ہیں لیکن ساتھ ہی طرفہ ترماجرا یہ ہے کہ آنحضرت شاعروں کی مدد سے ان کو اشعار میں مقابلہ جواب دیا کرتے تھے اور اپنے شاعروں کی تعریف کرتے تھے۔ چنانچہ سورہ شعراء کی آخری آیت میں یوں مرقوم ہے کہ **وَانتَصَرُوا مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنقَلَبٍ يَنقَلِبُونَ** یعنی اور بدلا لیا اس پیچھے کہ ان پر ظلم ہوا اور اب معلوم کرینگے ظلم کرنے والے کس کروٹ الٹے ہیں۔ معالم کے بیان کے مطابق آخری جملہ میں ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو آپ کی ہجو لکھا کرتے تھے خلاصۃ التفاسیر جلد سوم کا صفحہ ۳۸۸ ملاحظہ فرمائیے۔

نہیں ہے تمام قرآن میں کوئی آیت ان آیات سے زیادہ زور وشور سے اس امر کا بیان نہیں کرتی کہ قرآن من جانب اللہ ہے لیکن اس جوش و خروش اور سر گرمی ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد کے دل میں بجائے اس تسلی واطمینان کے جو ایسے شخص کو نصیب ہوتا ہے۔ جس کو اپنی باتوں پر کامل (مکمل) اعتماد و وثوق (بھروسہ) ہو بہت سے شکوک (شک) بھرے ہوئے تھے۔ جو ایمان واعتماد امن وچین خُدا کے پیغمبر و مرسل (رسول) کے دل میں ہونا چاہئے۔ وہ آنحضرت میں مطلق (بالکل) نظر نہیں آتا۔ قرآن کے جن مقامات سے مذکورہ بالا حالات کا پتہ ملتا ہے۔ ان میں سے بعض کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

چنانچہ سورہ تکویر کی ۱۵ آیت سے یوں مرقوم ہے **فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ** یعنی قسم کھاتا ہوں میں پیچھے ہٹ جاتے سیدھے چلتے دبک جانے والوں کی اور رات کی جب اس کا اٹھان (شروع) ہو۔ اور صبح کی جب دم لیوے۔ تحقیق یہ کہنا پیغام پہنچانے والے بزرگ کا ہے۔ قوت والا نزدیک صاحب عرش کے مرتبے والا۔ کہا مانا گیا اس جگہ باامانت اور یہ تمہارا رفیق (ساتھی) کچھ نہیں دیوانہ۔ پھر سورہ نجم کی ۴تا ۵ آیات میں اس طرح مندرج ہے۔ **إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ** یعنی یہ تو حکم ہے جو پہنچتا ہے۔ اس کو سکھایا سخت قوتوں والے نے پھر سورہ واقعہ کے تیسرے رکوع میں پایا جاتا ہے کہ **فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ لَّا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ** یعنی سو میں قسم کھاتا ہوں تارے ڈوبنے کی اور یہ قسم ہے اگر سمجھو تو بڑی قسم۔ بے شک یہ قرآن عزت والا ہے۔ لکھا چھپی کتاب میں۔ اس کو وہی چھوتے ہیں جو پاک بنے ہیں۔ اور **إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنزِيلًا** یعنی ہم نے اتارا تجھ پر قرآن سہج سہج اتارنا (سورہ دہر رکوع دوم)۔

**حمٓ وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ** یعنی قسم ہے اس کتاب واضح کی ہم نے رکھا اس کو قرآن عربی کا۔ شاید تم بوجھو اور یہ بڑی کتاب[33] میں ہم پاس ہے اونچا محکم (سورہ زخرف کی پہلی تین آیات)۔ اور سورہ فرقان کی چوتھی آیت سے یوں شروع ہوتا ہے **وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَٰذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَزُورًا وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ** یعنی اور کہنے لگے جو منکر ہیں اور کچھ نہیں یہ مگر جھوٹ باندھ لایا ہے اور ساتھ دیا ہے اس کا اس میں اور لوگوں نے۔ سو آئے بے انصافی اور جھوٹ پر اور کہنے لگے یہ نقلیں ہیں اگلوں کی جو لکھ لیا ہے۔ سو وہی لکھوائی جاتی ہیں اس پاس صبح و شام۔ تو کہہ اس کو اتارا اس شخص نے جو جانتا ہے چھپے بھید (راز) آسمانوں میں اور زمین میں۔ اور کہا رسول نے اے رب میرے میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو جھک جھک۔

پھر سورہ سجدہ کی دوسری آیت میں یوں لکھا ہے **أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ لِتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أَتَاهُم مِّن نَّذِيرٍ مِّن قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُونَ** یعنی کیا کہتے ہیں یہ باندھ لایا؟ کوئی نہیں وہ ٹھیک ہے تیرے رب کی طرف سے کہ تو ڈر سناوے ایک لوگوں کو جن کو نہیں آیا

---

[33] ام الکتاب یا کتاب کی ماں سے قرآن وہ اصل مراد ہے جو خُدا کے حضور ہر طرح کے تغیر و تبدل سے محفوظ و مامون رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ تفسیر حسینی جلد دوم صفحہ ۳۰۰ میں مندرج ہے کہ دراصل ہمہ کتاب سماوی یعنی لوح و محفوظ کہ ایمن است و تغیر

کوئی ڈرسنانے والا تجھ سے پہلے شاید وہ راہ پر آویں۔ پھر سورہ نحل کے ۱۴ رکوع اور آیت ۱۰۲ کے شروع میں یوں مندرج ہے **قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِن رَّبِّكَ بِالْحَقِّ** یعنی تو کہہ اس کو اُتارا ہے پاک فرشتہ نے تیرے رب کی طرف سے ساتھ حق کے۔

سورۃ الزمر غالباً اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ پہلی دفعہ مسلمانوں نے ابی سینیا کی طرف ہجرت کی۔ اس سورۃ میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ کہ قرآن لاکلام خُدا تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا۔ نیز اس سورۃ سے یہ بات بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ کہ اس قسم کے وحی سے کس قدر لوگوں پر خوف وہراس چھا جاتا تھا چنانچہ دوسری اور ۲۴ ویں آیات میں اس طرح مرقوم ہے **إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ** یعنی ہم نے اتاری ہے تیری طرف کتاب ٹھیک سو بندگی کر اللہ کی خالص کر کے اس کے واسطے بندگی۔ اور **اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ** یعنی اللہ نے اتاری بہتر بات کتاب آپس میں ملتی دہرائی[34] ہوئی۔ بال کھڑے ہوتے ہیں اس سے کھال پر ان لوگوں کے جو ڈرتے ہیں اپنے رب سے۔

متذکرہ بالا طریقے جو حضرت محمد نے اپنی بریت (نجات، رہائی) اور بے گناہی کے ثبوت میں استعمال کئے۔ ان کی بنیاد اس بات پر تھی کہ اگلے زمانہ کے پیغمبروں کے ساتھ بھی لوگوں نے ایسا ہی سلوک کیا تھا۔ قرآن کا عبارتی یا لفظی تکرار (بحث) اور وحی من اللہ ہونے کا متواتر (لگا تار، مسلسل) دعویٰ اس امر کو ثابت نہیں کرتے بلکہ قرآن کے پڑھنے سے عموماً جو پڑھنے والے کے دل پر تاثیر (اثر) ہوتی ہے وہ یہ کہ قرآن ایک ایسے شخص کی سخن سازی (شاعری) ہے جس کے اپنے دل ہی کو اطمینان حاصل نہیں ہے۔ اور زیادہ گوئی سے اس کی غرض صرف یہی نہیں ہے کہ اپنے مخالفوں کا منہ بند کرے بلکہ اپنے نامستقیم (غیر مضبوط) دل کو قرار دینا اور اپنے مقلدوں (تقلید کرنے والوں) کے ایمان کو مضبوط و مستحکم کرنا بھی اس کا مقصد اعلیٰ معلوم ہوتا ہے۔

ایام مکہ کے آغاز میں آنحضرت نے مشتہر (مشہور) کیا کہ جو لوگ قرآن کو میری جعلسازی بیان کرتے ہیں۔ اگر وہ سچے ہیں تو اس کی مانند کوئی کتاب بنالائیں۔ چنانچہ سورہ طور کے دوسرے رکوع میں مسطور ہے۔ **أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ بَل لَّا يُؤْمِنُونَ فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ** یعنی یا کہتے ہیں یہ بات بنالایا۔ کوئی نہیں۔ پر ان کو یقین نہیں پھر چاہئے کوئی لے آئیں بات اسی طرح کی اگر وہ سچے ہیں۔

---

[34] لفظ متانی یعنی دو دو یا جوڑے جوڑے کا ترجمہ راڈویل صاحب کے نزدیک ایسی تعلیم ہے جو کہ بالتکرار ہو اور پالگریواؤ پامر صاحب نے اس کا ترجمہ محض دہرانا کیا۔ سیل صاحب اس کے ترجمے کے بیان میں قرآن کے موجودہ مروجہ ترجمہ سے متفق ہیں۔ راڈویل صاحب کے قرآن صفحہ ۱۲۶ میں سورہ حجرہ کی ۸۷ آیت اور اس پر جو نوٹ ہے ملاحظہ کیجئے۔ ایک اردو ترجمہ میں یوں مندرج ہے کہ ایک مدعا کئی طرح بیان کیا۔ کتا باً متشابھاً مثانی پورے جملہ پر مفسیر حسین فارسی میں یوں تحریر فرماتے ہیں کہ کتابے مانند یکد دیگر یعنی قرآن کے بعضے ازاں مشابہ بعضے بہت درا عجاز زیادہ جودت لفظ وصحت معنٰی یا برخے ازاں مصدق برخے دیگر است دور آں تناقض واختلاف نیست مثانی۔ دوبارہ ود توکردہ یعنی مشتمل است برزوجات چوں امر ونہی وعدد وعید وذکر وفکر رحمت وعذاب وبہشت دوزوخ ومومن کافر دیکھو تفسیر حسینی جلد دوم صفحہ ۲۶۲۔ ربی گیگر فرماتے ہیں کہ لفظ مثانی کی نسبت تمام تر تشویش وگھبراہٹ کا باعث یہ ہے کہ یہ لفظ عربی خیال کیا گیا ہے اور اس کے اصلی ماخذ کی تحقیق وتدقیق نہیں کی گئی۔ یہودی شریعت مکتوب وغیر مکتوب دو حصوں میں منقسم تھی۔ غیر مکتوب کو مشناہ کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ تمام تعلیم واحادیث اسی نام سے نامزد ہو گئیں ایک حرفی غلطی کے واقع ہونے سے یہ لفظ مشناہ ایک لفظ کے مشتقات میں سے خیال کیا گیا جس کے معنی دہرانے یا مکرر کہنے کے ہیں۔ سو یہ لفظ بجائے مجموعہ احادیث وروایات کے مرقومہ یا مکتوبہ شریعت کے دہرانے اور مکرر کہنے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ عربی یہودیوں نے بھی یہی غلطی کی اور مثانی ہو گیا۔ اگر حضرت محمد نے اس لفظ کا درست استعمال کیا ہے تو انہوں نے ضرور قرآن کو تمام یہودی شریعت یعنی مشناہ کی جگہ قرار دیا ہے۔ اور ہر گز ہر گز ان کی مراد اس سے دہرانے یا مکرر کہنے کی نہ تھی۔ گیگر کی کتاب یہودیت واسلام کے صفحہ ۴۳ میں مندرج ہے کہ کم از کم طاؤس ایک عربی مفسر اس بات کا قائل ہے کہ تمام قرآن مثانی ہے چنانچہ لکھا ہے کہ وقال الطاوس القرآن کلہ مثانی۔ وحی سے جو لوگوں پر خوف طاری ہوتا تھا یہ کچھ تعجب کی بات نہ تھی کیونکہ آسمان پر بھی وحی کی تاثیر اس قدر مانی جاتی تھی کہ وحی کے وقت تمام نظام قدرت پر تشنج کا عالم ہوتا تھا۔ فرشتگان بے حس وحرکت ہو جاتے تھے اور صرف جبرائیل کو پہلے ہوش آتا تھا۔ خلاصۃ التفاسیر جلد چہارم صفحہ ۷۵۔

سورہ بنی اسرائیل[35] ایام مکہ کے دوسرے زمانہ کی سورتوں میں سے ہے اور اس کے دسویں رکوع میں بھی متذکرہ بالا دعویٰ کا الحاح (گڑگڑانا) پایا جاتا ہے۔ چنانچہ یوں لکھا ہے **قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَى أَن يَأْتُواْ بِمِثْلِ هَـذَا الْقُرْآنِ لاَ يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا** یعنی کہہ اگر جمع ہوویں آدمی اور جن اس پر کہ لاویں ایسا قرآن نہ لاوینگے ایسا قرآن۔ اور پڑے مدد کریں ایک کی ایک۔ پھر تھوڑے دن بعد آپ نے اسی طرح سے دعویٰ کیا۔ چنانچہ سورہ ہود کی سولھویں آیت میں یوں مرقوم ہے **أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُواْ بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُواْ مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ** یعنی کیا کہتے ہیں باندھ لایا ہے اس کو تو کہہ تم لے آؤ ایک دس سورتیں ایسی باندھ کر۔ اور پکارو جس کو پکار سکو اللہ کے سوا اگر ہو تم سچے۔

یہ دلیل (گواہی) ایسی قاطع (کاٹنے والا) اور مضبوط خیال کی جاتی تھی کہ مدینہ میں جاکر بھی آنحضرت نے اسی کو پیش کیا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی اکیسویں آیت میں یوں مندرج ہے **وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَى عَبْدِنَا فَأْتُواْ بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ** یعنی اور اگر تم ہو شک میں اس کلام سے جو اتارا ہم نے اپنے بندے پر تو لے آؤ ایک سورۃ اس قسم کی۔

برادران اہلِ اسلام اس امر کا دعویٰ کرتے ہیں کہ اس وقت سے لے کر آج تک کسی عرب و عجم (عرب کے سوا کوئی ملک) نے اس قرآنی للکار کے مقابلہ کی جرات نہیں کی اور کسی نے کبھی یہ حوصلہ نہیں کیا کہ قرآن کے مقابلہ میں کچھ لکھنے یا اس کی نظیر (مثال) پیش کرنے کا دم مارے۔ لیکن اس دعویٰ کے بیان میں بہت مبالغہ (زیادہ گوئی) کیا جاتا ہے کہ کیونکہ قرآن کی یہ للکار اس امر کی متقاضی (تقاضا کرنے والی) نہ تھی۔ کہ قرآن کی عروض (ظاہر ہونا) اور اس کی منظوم عبارت (ترتیب کی گئی عبارت) کی نظیر (مثال) پیش کی جائے۔ بلکہ اس کا اشارہ نفسِ مضمون یعنی تعلیم توحیدِ الٰہی اور آخرت کی سزا و جزا وغیرہ کی طرف تھا۔

پس قریش کے لئے ان مضامین پر قرآن کی نظیر پیش کرنا ایک امر محال (مشکل) تھا۔ وہ جو کہ بُت پرست و باطل پرست (جھوٹے) تھے۔ اور اس قسم کے مسائل کے معتقد (اعتقاد رکھنے والے) نہ تھے۔ ان کے لئے کس طرح ممکن تھا۔ کہ ایک ایسی کتاب پیش کریں جو قرآن کی نظیر ہو۔ اور اسی طرح توحیدِ الٰہی کا بیان کرے؟ اگر وہ اس قسم کی کتاب لکھنے کی کوشش بھی کرتے تو اس میں شک نہیں۔ کہ وہ ضرور قرآن ہی کی نقل کرتے اور چونکہ نقل کا درجہ ہمیشہ اصل سے کم ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت محمد ضرور ان پر سبقت (برتری)[36] لے جاتے۔ تو بھی اگر فوقیت (سبقت، برتری) طرزِ بیان اور عبارت کے ربط ضبط (میل ملاپ) سے مراد ہے۔ تو بیرن ڈی سیلن صاحب کا بیان بالکل بجا اور تیر بہدف (تیر کا نشانہ پر لگنا) کا حکم رکھتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر اب ہم قرآن کو قواعدِ عروض (نظم کے قواعد) کی رو سے بہ نظر غور دیکھیں تو موجودہ اسلامی کالجوں کے علوم کے بموجب قرآن عبارتی نظم و نسق اور ربط ضبط کا ایک اعلیٰ اور بے نظیر نمونہ ہے۔ کیونکہ عروض وغیرہ کے متعلق موجودہ قواعد جس قدر ہیں وہ سب کے سب اسی سے لئے گئے ہیں۔ پامر صاحب فرماتے ہیں کہ اہل عرب کے لائق فائق (لیاقت میں فوقیت رکھنے والے) مصنفین کا قرآن کے مقابلہ میں اس پایہ کی کوئی کتاب پیش نہ کرنا باعثِ حیرت اور جائے تعجب نہیں ہے۔ کیونکہ وہ پہلے ہی سے اس امر کو ناممکن قرار دے چکے ہیں۔ اور اس کے طرز بیان کو بے نظیر اور عدیم المثال (جس کے برابر کوئی نہ ہو) مان چکے ہیں۔ پس اس سے ہر طرح کا خلاف و نحراف (مخالف و مخالفت) اعلیٰ درجہ کا نقص اور عیب خیال کیا جاتا ہے۔ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے مسلمہ دعویٰ کے باعث اہلِ اسلام کے لئے اس کے کسی لفظ یا حرف پر بھی انگشت اعتراض (انگلی اُٹھانا، اعتراض کرنا) اٹھانا ناممکن ہے۔ اور

---

[35] یہ سورۃ ایک مرکب المضمون سورۃ ہے ۲۳ سے ۴۱ آیت تک ضرور ایام مکہ سے متعلق ہے اور ۷۵ سے ۸۲ تک اور ۸۷ آیت بھی اسی زمانہ سے علاقہ (تعلق) رکھتی ہے۔

[36] نولدیکی صاحب کی کتاب گشختی دس قرآن کا صفحہ نمبر ۴۴ ملاحظہ فرمائیے۔

برخلاف اس کے کوئی قرآن کی نقطہ چینی کرے قرآن اس درجہ کا اعلیٰ و برتر تسلیم کیا گیا ہے۔ کہ دیگر کتب کا اس کو منصف و مصدق (انصاف کرنے والا و تصدیق کرنے والا) قرار دیا جاتا ہے۔ عالمانِ علم وادب مولفانِ لغت اور تمام فصیح و بلیغ (خوش بیان) عالم و فاضل علمائے اسلام اس امر کو بلا دلیل ہی تسلیم کر چکے ہیں۔ کہ قرآن میں کسی طرح کی غلطی کا امکان ہی نہیں ہے اور دیگر کتب کو وہیں تک فصاحت و بلاغت (خوش بیانی و حسب موقع گفتگو) کا رتبہ حاصل ہے۔ جہاں تک ان میں قرآن کی مطابقت (مشابہت) اور موافقت (برابری)[37] پائی جاتی ہے۔ اہلِ اسلام نے اب تک بالاتفاق اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ قرآن کن معنوں میں فوقیت (برتری) کا دعویدار ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ فوقیت قرآن کی فصاحت و بلاغت یا اس کے نفس مضمون یا مختلف حصص کی مطابقت اور مشابہ[38] سے ثابت ہوتی ہے۔ فرقہ معتزلین کا اعتقاد (یقین) ہے۔ کہ اگر خُدا انسان کو اجازت دیتا تو ضرور لوگ قرآن کی مانند فصاحت و بلاغت اور استدلال[39] سے بھری ہوئی سورتیں بنا کر پیش کر سکتے تھے۔

سورۃ الشوریٰ جو کہ آخری زمانہ کی مکی سورتوں میں سے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک آنحضرت مکہ میں تشریف فرما رہے ہمیشہ اہل مکہ آپ پر یہ الزام لگاتے رہے کہ قرآن من جانب اللہ نہیں ہے بلکہ آپ کی افترا و اختراع (دماغ کی ایجاد) کا ظہور ہے۔ چنانچہ ۲۴ آیت میں مرقوم ہے۔ **أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِبًا فَإِن يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَى قَلْبِكَ** یعنی کیا کہتے ہیں اس نے باندھا اللہ پر جھوٹ سو اگر اللہ چاہے مہر کر دے[40] تیرے دل پر۔

آنحضرت کے ایامِ حیات میں یہ اوّل موقعہ تھا۔ کہ یہودی دین کے معتقدوں (اعتقاد رکھنے والوں) اور آپ کے درمیان ایک رشتہ قائم ہوا۔ جب تک آپ مکہ میں رہے آپ کی نظیر میں مذہب یہود اور دین عیسوی اسلام کے ہم پلہ اور ہم رتبہ تھے۔ اور آپ کا خیال تھا کہ ان ادیان (دین کی جمع) کے معتقدان کے مطابق چلنے سے نجات حاصل کرینگے۔ بلکہ زمانہ مابعد میں آپ نے مدینہ پہنچ کر بھی فرمایا تھا۔ تحقیق جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین۔ جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور کام کیا نیک۔ تو ان کو ہی ان کی مزدوری اپنے رب کے پاس اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

سورہ رعد جو کہ آخری زمانہ کی مکی سورت ہے اس میں بھی حضرت محمد ﷺ نے بیان فرمایا ہے کہ آپ پر وحی نازل ہونے کے باعث یہودی بہت خوش تھے۔ چنانچہ پانچویں رکوع کی آیت ۳۶ میں مندرج ہے۔ **وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَفْرَحُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ** یعنی اور جو لوگ[41] کہ دی ہے ہم نے ان کو کتاب خوش ہوتے ہیں اس سے جو اتارا گیا تیری طرف۔

---

[37] Sacred Books of The Past vol vi pp 55

[38] Muir's Beacon of Truth صفحہ ۲۶

[39] Faith of Islam مصنفہ سیل صاحب صفحہ ۹

[40] اس آیت کا ٹھیک مطلب بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ غالباً اس کے معنی یہی معلوم ہوتے ہیں کہ اگر خُدا چاہتا ہے تو تیرے ایسا کرنے پر تجھ سے رسالت و پیغمبری کو واپس لے لیتا اور اگر یہ الزام ٹھیک نہیں بلکہ محض اتہام ہے تو اپنے دل کو مضبوط کر اور صبر سے برداشت کر۔ تفسیر حسینی کی جلد دوم کے صفحہ ۲۹۵ پر یختم علی قلبک کی یوں تشریح کی جاتی ہے کہ مہر نہد بر دل تو اگر افتد اکنی۔ و قرآن بر تو فراموش گرداند۔ یا مہر نہد بر دل تو بصبر و شکیبائی تا از آزار و جفائے ایشاں متعزز نہ باشی یا مہر شوق ابدی و محبت لم یزلی در دل تو نہد تا التفات بغیر دے نہ کنی و از اجابت و ابائے خلق فارغ گردی۔

[41] اس جگہ صاحب کتاب سے یہودی لوگ مراد ہیں جو کہ حضرت محمد کی مرسلانہ زندگی کے اس حصّہ میں جب انہوں نے اپنی کتابوں اور تواریخ کی تعریف سنی تو بہت خوش ہو گئے۔ ان باتوں کا بیان آخری زمانہ کی مکی سورتوں میں مندرج ہے۔ راڈویل صاحب کے قرآن کا صفحہ ۴۲۷ ملاحظہ فرمائیے۔

اگرچہ آنحضرت کے ایام مکہ میں ظاہری طور پر یہودیوں سے رابطہ اتحاد و قائم تھا۔ تو آپ یہودی دین کو اسلام سے کم درجہ کا قرار دیتے تھے اور جب آپ مدینہ تشریف لے گئے تو اس امر کا صاف بیان کر دیا۔ اور دو آخری مکی سورتوں میں اس طرح مرقوم ہے۔ **وَإِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ**

یعنی اور یہ لوگ ہیں تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں تمہارا رب سو مجھ سے ڈرتے رہو۔ (سورہ المومنون رکوع ۴ آیت ۵۶) اور **إِنَّ هَذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ** یعنی یہ لوگ ہیں۔ تمہارے دین کے سب ایک دین پر اور میں ہوں رب تمہارا سو میری بندگی کرو (سورۃ الانبیاء رکوع ششم)۔

عہد عتیق اور تواریخ یہود کی نسبت قرآن میں بہت سی باتیں مندرج ہیں۔ اور ان کا بیان کئی طرح پر ہے قرآن کا مدعا (مقصد) محض یہی نہیں۔ کہ وہ اپنے آپ کو من جانب اللہ اور کلام الہیٰ ثابت کرے۔ بلکہ پہلی کُتب مقدسہ کی صداقت (سچائی) کا اظہار بھی اس کا مقصد اعلیٰ ہے۔ چنانچہ سورۂ احقاف کے دوسرے رکوع کی دوسری آیت میں یوں مندرج ہے۔ **وَمِن قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَى إِمَامًا وَرَحْمَةً وَهَذَا كِتَابٌ مُّصَدِّقٌ لِّسَانًا** یعنی اور اس سے پہلے کتاب موسیٰ کی ہے اور راہ ڈالتی اور رحمت اور یہ کتاب سچا کرنے والی ہے اس کو عربی زبان میں۔

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ مکہ میں جن یہودیوں سے آنحضرت کا رابطہ اتحاد قائم تھا۔ انہوں نے آپ سے کہا کہ توریت میں خُدا تعالیٰ اکثر رحمٰن کے نام سے پکارا گیا ہے اور ہم دیکھتے ہیں۔ کہ آپ اس کو کبھی اس نام سے نہیں پکارتے۔ آپ پر فی الفور وحی نازل ہوئی اور فرمایا۔ **قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ** یعنی کہہ اللہ کر پکارو یا رحمٰن کر جو کہہ کر پکارو گے سو اس کے ہیں سب نام خاصے (سورہ بنی اسرائیل رکوع ۱۲)۔

آخری سورتوں میں لفظ رحمٰن[42] اس خوف سے کہ مبادا اللہ والرحمن دو خُدا سمجھے جائیں بالکل استعمال نہیں کیا گیا۔ اس خطرہ کی نسبت قرآن بھی متنبہ (آگاہ) کرتا ہے چنانچہ سورہ نحل کی ۵۱ آیت میں مندرج ہے۔ **وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ** یعنی اور کہا اللہ نے نہ پکڑو معبود دو (جس کی عبادت کی جائے، اللہ تعالیٰ) وہ معبود ایک ہی ہے سو مجھ سے ڈرو۔

قبیلہ قریش کے لوگوں نے بھی لفظ الرحمٰن پر اعتراض کیا اور کہنے لگے۔ ما الرحمن اسجد لما تامرنا یعنی کیا ہے رحمٰن؟ کیا سجدہ کرنے لگیں ہم جس کو تو فرماویگا؟ (سورہ فرقان رکوع پنجم) جب قریش نے یہ کہا تھا کہ کیا ہم ایک پاگل اور دیوانے شاعر کے کہنے سے اپنے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ تو اس کا جواب یوں دیا گیا تھا کہ نہیں وہ پاگل اور دیوانہ نہیں ہے بلکہ وہ سچائی کے ساتھ آیا ہے۔ اور جو اس سے پہلے بھیجے گئے ان کی باتوں کی تائید (حمایت) کرتا ہے۔ اور ان کے پیغام کو سچ ثابت کرتا ہے۔ مفسرین کے بیان کے مطابق جو اس سے پہلے بھیجے گئے تھے ان سے قدیم زمانہ کے نبی اور پیغمبر مراد ہیں جو آنحضرت سے پہلے اللہ جلشانہ کی طرف سے لوگوں کی ہدایت و رہبری کے لئے دنیا میں بھیجے گئے۔ چنانچہ سورہ جاثیہ کی ۱۵ اور ۱۶ آیت میں یوں مرقوم ہے **وَلَقَدْ آتَيْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ** اور **ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا**۔ یعنی اور ہم نے دی ہے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکومت اور پیغمبری۔ پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک رستے پر اس کام کے سو تو اسی پر چل۔

---

[42] لفظ الرحمٰن کے استعمال سے ان سورتوں کے وقتِ نزول کا بھی کس قدر پتہ ملتا ہے۔

بہت سے اس قسم کے جملات پائے جاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ حضرت محمد صاحب نے زمانہ قدیم کی یہودی تواریخ سے کسی قدر واقفیت حاصل کرلی تھی۔ لیکن اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ آنحضرت نے کبھی بائبل شریف کا مطالعہ[43] کیا۔ آنحضرت کے بیانات بائبل شریف سے توکچھ مطابقت نہیں رکھتے۔ پر یہودیوں کے ربیوں کے قصہ کہانیوں اور تذکرۃ الاوّلیا سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ضرور آپ کی چند یہودیوں سے آشنائی اور دوستی تھی۔ جن سے آپ نے وہ تمام سرمایہ مضامین میں جمع کیا جس کا آپ نے بعد میں قرآنی وحی الہام کے پیرایہ میں ذکر کیا۔ میور صاحب کا بیان ہے۔ کہ قرآن میں سچ اور جھوٹ دونوں ملے ہوئے ہیں۔ یہ وضعی تشریحات و تصورات اور طفلانہ (بچوں کی طرح) بے مغزی سے پُر ہے۔ اس میں بہت سے بناوٹی قصے اور کہانیاں بار بار بیان کی گئی ہیں۔ اور آنحضرت کی یہ متواتر جدوجہد کہ اپنے آپ کو اگلے زمانے کے انبیاء سے ماناومشابہ ثابت کرے اور آپ کا اپنے زمانہ کی گفتگو اور محاورات کو ان کے منہ میں ڈالنا۔ اور ان کے مفروضہ مخالفین کے جوابات کا بار بار پیش کرنا قرآن کے پڑھنے والے کو مضمحل (کمزور) اور متنفر (نفرت کرنے والا) کردیتا ہے[44]۔ اس جگہ زیادہ تر قابلِ غور یہ بات ہے کہ آپ کا ان تمام اخبار کو وحی کی زبانی بیان کرنے سے یہ مطلب تھا۔ کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا بلکہ جیساخُدا کی طرف سے حکم آتا ہے ویسا ہی بیان کرتا ہوں۔ چنانچہ سورۂ ص کے پانچویں رکوع میں یوں مندرج ہے۔ **مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَى إِذْ يَخْتَصِمُونَ إِن يُوحَىٰ إِلَيَّ إِلَّا أَنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ**۔ یعنی مجھ کو کچھ خبر نہ تھی اوپر کی مجلس کی جب آپس میں تکرار کرتے ہیں۔ مجھ کو تو یہی حکم آتا ہے کہ اور نہیں میں ڈر سنانے والا ہوں کھول کر۔

گمان غالب ہے کہ آپ نے یہ باتیں یہودیوں سے سیکھیں ہونگی۔ لیکن ان کو نبی اللہ ہونے کی دلیل گردانتے ہیں۔ نیز آنحضرت کا دعویٰ ہے کہ حضرت یوسف کا قصہ بھی آپ کو بذریعہ وحی الہیٰ معلوم ہوا۔ چنانچہ سورۂ یوسف کی تیسری آیت میں مرقوم ہے۔ **نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ هَـٰذَا الْقُرْآنَ**۔ یعنی ہم بیان کرتے ہیں تیرے پاس بہتر بیان اس واسطے کہ بھیجا ہم نے تیری طرف یہ قرآن۔ اس کے بعد حضرت یوسف کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ اور وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ یہودیوں کے تذکرۃ الاوّلیا میں پایا جاتا ہے۔ پر سورہ یوسف کے گیارہویں رکوع اور ۱۱۱ آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قصہ حضرت محمد کو خود خُدا نے وحی کے وسیلہ سے یعنی فرشتہ جبرائیل کی معرفت سکھلایا[45] چنانچہ لکھا ہے۔ **ذَٰلِكَ مِنْ أَنبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ**۔ یعنی یہ خبریں ہیں غیب کی ہم بھیجتے ہیں تجھکو۔

---

[43] اس میں کلام نہیں کہ حضرت محمد نے یہودی یا عیسائی دین کی کوئی کتاب خود نہیں پڑھی اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جس قدر عہد عتیق کے قصص درج ہیں وہ سچے اور اصلی ہونے کی نسبت بناوٹی کہانیوں اور افسانوں سے زیادہ تر مشابہت رکھتے ہیں اور عہد جدید کی نسبت جس قدر بیانات ہیں وہ سب کے سب پرانی خیالی کہانیوں کی مانند ہیں اور غیر معتبر اناجیل کے بیان سے ملتے جلتے ہیں۔ نولدیکی صاحب کی کتاب گشختی دس قرآن کا چھٹا صفحہ ملاحظہ فرمایئے سورہ اعراف کی ۱۵۶ و ۱۵۸ آیت میں النبی الامی یعنی ان پڑھ نبی سے بھی متذکرہ بالا امور کی تائید ہوتی ہے۔ سورہ بقرہ کی ۷۳ ویں آیت میں و منہم امیون یعنی وہ جو یہودیوں میں سے ان پڑھ ہیں مندرج ہے اور اس سے وہ یہودی مراد ہیں جو توریت شریف سے ناواقف ہیں اور اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جن کو کُتب مقدسہ کا کچھ علم نہ تھا۔ اسی طرح حضرت محمد کے حق میں جو لفظ الامی استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ آنحضرت کو بائبل شریف یعنی قدیمی کُتب مقدسہ کا کچھ علم نہ تھا۔ اہل اسلام کے بیان کے مطابق ہرگز ہرگز اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ چونکہ آنحضرت ایسے لکھے پڑھے اور خواندہ نہ تھے کہ قرآن جیسی کتاب بنالیتے اس لئے قرآن کلام الہیٰ ہے سیل صاحب کی کتاب عقیدہ اسلام کا تیرھواں صفحہ مطالعہ کیجئے۔ الامی سے یہ بات مطلق ثابت نہیں ہوتی کہ آنحضرت پڑھنے سے عاجز تھے یا ایک ان پڑھ اور جاہل آدمی تھے۔ دیکھو صفحہ ۱۱ نولدیکی صاحب کا گشختی دس قرآن۔ علاوہ اس کے گیگر صاحب کی کتاب یہودیت و اسلام کے بیسویں صفحہ پر ایک نہایت دلچسپ حاشیہ کا بھی مطالعہ کیجئے۔ عہد عتیق سے قرآن میں صرف ۳۷ ویں زبور کی ۲۹ ویں آیت اقتباس کی گئی ہے چنانچہ سورۃ الانبیاء کے ساتویں رکوع میں مندرج ہے **وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِن بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ** اور ہم نے لکھ دیا ہے زبور میں نصیحت کے بعد کہ آخر زمین پر مالک ہونگے میرے نیک بندے۔

[44] لائف آف محمد مصنفہ میور صاحب دوسری جلد صفحہ نمبر ۱۸۵۔

[45] سورہ ص کی ۷۰ آیت میں پیدائش مخلوقات کے باب میں بھی ایسا بیان پایا جاتا ہے۔

باوجود ان تمام الہیٰ دعووں اور اظہار وحی کے اہل مکہ نے آپ کا اعتبار نہ کیا اور یوں کہنے لگے **انما یعلمه بشر** یعنی اس کو تو سکھاتا ہے آدمی۔ آنحضرت اس اتہام (الزام) کا جواب اسی آیت میں یوں دیتے ہیں۔ کہ جس شخص کی نسبت تم کو شک ہے کہ وہ مجھ کو سکھاتا ہے وہ تو اجنبی ہے عرب[46] نہیں یعنی اس کی زبان عربی نہیں ہے اور قرآن صاف عربی زبان میں ہے۔

حضرت محمد کے مندرجہ بالا جواب کی اس طرح بآسانی تردید (رد کرنا) ہو سکتی ہے۔ کہ وہ شخص آپ کو مضامین بتاتا تھا اور آپ ان کو عربی زبان میں پیش کرتے اور سناتے تھے۔ حضرت محمد کو بار بار اس قسم کے الزامات کی تردید کرنی پڑی تھی۔ چنانچہ سورہ فرقان کی پانچویں آیت میں یہ الزام پایا جاتا ہے۔ **وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ هَذَا إِلَّا إِفْكٌ افْتَرَاهُ وَأَعَانَهُ عَلَيْهِ قَوْمٌ آخَرُونَ**۔ یعنی اور کہنے لگے جو منکر ہیں اور کچھ نہیں مگر یہ جھوٹ باندھ لایا ہے اور ساتھ دیا ہے اس کا اس میں اور لوگوں نے۔

قبیلہ قریش کے لوگ اپنے معتقدات پر جمے رہے اور جن قصوں کی بابت آنحضرت کا یہ دعویٰ تھا کہ جبرائیل کی معرفت آپ کو خُدا نے سکھلائے وہ ان سب کو یہودی تواریخ سے منسوب کرتے رہے۔ چنانچہ سورہ فرقان کی چھٹی آیت میں مرقوم ہے۔ **وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا**۔ یعنی نقلیں ہیں اگلوں کی کہ لکھ لیا ہے ان کو سو وہی لکھوائی جاتی ہیں اس پاس صبح و شام۔

اب قبیلہ قریش کے لوگوں نے ایک نئی روش اختیار کی اور وہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت محمد کے خاندان کو برادری سے خارج کر دیا اور ان سے ہر طرح کی برادرانہ راہ و رسم کو منقطع (ختم) اور بند کر دیا اور کچھ عرصہ تک حضرت محمد اپنے تمام خاندان سمیت شہر مکہ کے ایک حصّہ میں بالکل تنہا اور علیحدہ رہے پر اس کے بعد چند قریشی آپ پر ترس کھانے اور نرم دل ہونے لگے۔ عین اسی موقع پر آنحضرت کے حامی و حافظ عم (چچا) مشفق ابو طالب وفات پا گئے اور ان سے پانچ ہفتے بعد آپ کی مہربانی اور پیاری زوجہ خدیجہ بھی اس دار ناپائدا (فانی دُنیا) سے کوچ کر گئیں۔ اور ان حادثات کے باعث اب معاملہ نہایت نازک ہو گیا۔

اب حضرت محمد نہایت غمزدہ بے یار و غمخوار اور از حد ناامیدی کی حالت میں پڑ کر اس شش و پنج (سوچ بچار) میں تھے۔ کہ اہالیانِ طائف مجھے اس حالت میں کہ اہل مکہ رد کر چکے ہیں قبول کرینگے یا نہیں۔ طائف مکہ سے مشرق کی طرف قریباً ستر میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آنحضرت اپنے وفادار غلام زید کے ساتھ جو آپکا متبنیٰ (لے پالک بیٹا) بھی تھا طائف میں وارد ہوئے۔ اور روسائے شہر سے ملاقات کی اور اپنے مدعا (مقصد) سے آگاہ کیا پر انہوں نے آپ کو قبول نہ کیا اور آپ کی تعلیم کے شنوا (سُننے والے) نہ ہوئے۔ دس دن کے بعد آنحضرت پر پتھراؤ کیا گیا۔ اور آپ کو نہایت زخمی اور خستہ خاطر ہو کر اس شہر سے بھاگنا پڑا۔ جب آپ مکہ کو واپس آتے وقت نصف راہ طے کر چکے تو وادی نخلہ میں آپ نے قیام کیا۔ اور اپنے پیغام کی تردید اور خستہ حالی کے باعث آپ پر ایک ایسی حالت طاری ہوئی کہ اپنے توہمات و خیالات میں غلطاں و پیچاں ہو کر آپ نے جنوں کی ایک جماعت کو اسلام قبول کرتے ہوئے دیکھا۔ اور سورہ جن نازل ہوئی[47]۔ (قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّهْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا وَّ اَنَّهُ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا)

---

[46] اعجمی کا ترجمہ مفسر حسین کے نزدیک فصاحت سے خالی ہے اور وہ بیان کرتا ہے کہ حضرت محمد کی تقریر فصاحت و بلاغت سے پر تھی پھر کیونکر ہو سکتا ہے کہ آنحضرت نے ایک ایسے شخص سے قرآن سیکھا ہو جو کہ فصیح و بلیغ نہ تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اعجمی سے عبرانی مراد ہے۔ ویری صاحب کی تفسیر قرآن کی جلد سوم صفحہ ۴۵ پر اس آیت پر ایک بہت لمبا چوڑا نوٹ قابل ملاحظہ ہے ۱۱۹ و ۱۲۰ اور ۱۲۵ آیات صاف مدنی ہیں اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سورہ نحل مکی و مدنی ملی جلی ہے۔

[47] راڈویل صاحب کے قرآن کے صفحہ ۱۵۷ کا حاشیہ نمبر ۳ ملاحظہ فرمائے۔ اس سفر کا مفصل حال دریافت کرنے کے لئے لائف آف محمد جلد دوم مصنفہ میور صاحب کو ۲۰۰ سے ۲۰۷ صفحہ تک مطالعہ کیجئے۔

ترجمہ تو کہہ کہ مجھ کو حکم آیا ہے۔ کہ سن گئے کتنے لوگ جنوں کے۔ پھر کہا ہم نے سنا ہے کہ ایک قرآن عجیب۔ سمجھاتا ہے نیک راہ سو ہم اس پر یقین لائے۔ اور یہ کہ جس وقت کھڑا ہوا اللہ کا بندہ اس کو پکارتا تو لوگ ہونے لگتے ہیں اس پر ٹھٹھہ۔

جب حضرت محمد کے پیغام کو جنات نے اس قدر سر گرمی سے قبول کیا۔ تو آپ کو بہت تسکین (تسلی) ہوئی۔ کیونکہ انسانوں کی حقارت و بے پروائی سے آپ نہایت آزردہ دل (ناراض دل) اور پژمردہ خاطر (مایوس) تھے۔ اس واقعہ کا بیان سورہ احقاف کے چوتھے رکوع میں یوں مندرج ہے۔ یعنی اور جب متوجہ کر دئے ہم نے تیری طرف کئی لوگ جنوں میں سے سننے لگے قرآن باوجود اس سب کے آپ کا طائف میں جانا بے فائدہ تھا۔ حضرت محمد نے بہت کوشش کی اور بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن آپ کی تمام تر کوششوں کا نتیجہ سوائے ناکامیابی کے اور کچھ نہ ہوا۔ اس خیال کے مطابق میور صاحب فرماتے ہیں۔ کہ حضرت محمد کا طائف سے مکہ کی طرف جو سفر تھا وہ شجاعت و بہادری سے خالی نہ تھا۔ آنحضرت کو اپنے ہی خاندان کے لوگوں نے رد کر دیا تھا۔ خاندان سے خارج کئے گئے سب آپ کو حقیر (بے قدر) جانتے تھے۔ لیکن آپ نہایت بہادری کے ساتھ خُدا کی بزرگی و جلال کے لئے جس طرح حضرت یونس نینوہ کے بُت پرست لوگوں کی فلاح و بہتری کے لئے ہمہ تن (بالکل) ساعی و کوشاں (کوشش کرنے والا) تھے۔ اسی طرح آپ اکیلے اپنے ہم وطنوں کو عذاب الہٰی سے ڈراتے اپنی رسالت اور توبہ واستغفار کی منادی کرتے رہے۔ اور طرح طرح سے ثابت کرتے رہے کہ میں مرسل من اللہ (اللہ کی طرف سے بھیجا گیا) ہوں۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت کے دل میں اس امر کا نہایت ہی پختہ یقین تھا۔ کہ میں خُدا کی طرف سے ہوں۔ جب آپ طائف سے مکہ میں واپس آئے۔ تو قریش کو کمافی السباق سخت مخالف پایا۔ اب یہ بات اظہر من الشمس (سورج کی طرح صاف و عیاں) تھی کہ فریقین میں سے ایک ضرور مغلوب ہو جائیگا۔ آنحضرت کے خاطر خطیر (کثیر خیال) میں رفتہ رفتہ مکہ سے ہجرت[48] کر جانے کا خیال موجزن ہونے لگا۔ کیونکہ مکہ میں آپ بالکل ناکامیاب رہے۔ آنحضرت حسب و نسب میں اعلیٰ تھے اور محافظانِ کعبہ سے آپ کا رابطہ اتحاد قائم تھا۔ آپ میں صبر و شجاعت (بہادری) اور فصاحت و بلاغت (خوش کلامی و حسب موقع گفتگو) وغیرہ بہت سی ذاتی خوبیاں تھیں لیکن باوجود اس سب کے پھر بھی بہت تھوڑے لوگ آپ پر ایمان لائے۔

مکہ میں آپ کو کسی طرح سے ذرا بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ اور اب آپ کے لئے سوائے اس کے کسی اور جگہ جا کر قسمت آزمائی کریں اور کوئی امید باقی نہ تھی۔

حضرت محمد شہر یثرب سے بخوبی واقف ہی تھے۔ آپ کے دادا اور پڑدادا یثرب کے باشندے تھے اور آپ کے والد صاحب کی قبر اسی شہر میں تھی۔

---

[48] سورہ عنکبوت کے چھٹے رکوع میں اشارۃً اس بات کا ذکر پایا جاتا ہے چنانچہ لکھا ہے **يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ** یعنی اے میرے بندو جو یقین لائے ہو میری زمین کشادہ ہے سو مجھ ہی کو بندگی کرو۔ راڈویل صاحب اس کی یوں تفسیر کرتے ہیں کہ اگر تم اپنے وطن سے نکالے جاؤ تو تم کو ضرور زمین میں ایسی پناہ کی جگہ مل سکتی ہے جہاں بلا خوف اکیلے سچے خُدا کی عبادت کر سکو۔ یہ آیت بالکل صاف طور سے ایام مکہ کے آخری حصّہ کی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت محمد کے اس قسم کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کی مکہ سے ہجرت بہت قریب الوقوع تھی۔ راڈویل صاحب کے قرآن کا ۳۲۹واں صفحہ مطالعہ کیجئے۔

مفسرین ارضی واسعتہ کی تفسیر میں کہتے ہیں زمین کشادہ است ہجرت کنید اموضع خوف بمنزل امن (تفسیر حسینی جلد دوم صفحہ ۱۸۳واں) بعض کے نزدیک اس میں خاص مدینہ کی طرف اشارہ ہے (تفسیر ابن عباس صفحہ ۴۶۱واں) یوں بھی لکھا ہے کہ مکہ کے مصیبت زدہ اور مظلوم مسلمانوں کی تسلی و تشفی کے لئے یہ آیت نازل ہوئی تھی اور کفارہ سے لڑنے کا حکم ابھی صادر نہیں ہوا تھا بلکہ یہ حکم ملا تھا کہ بھاگ کر اپنی جان بچاویں (خلاصتہ التفاسیر جلد سوم صفحہ ۴۷۱واں) ان تمام متذکرہ بالا باتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت حضرت محمد اپنے مومنین کو مکہ سے ہجرت کرنے کے لئے تیار کر رہے تھے۔

اہالیان مکہ و مدینہ کے درمیان بہت کچھ حریفانہ خیالات نے جڑ پکڑی ہوئی تھی جس شخص کی مکہ میں تحقیر و بے عزتی کی جاتی تھی ممکن نہ تھا۔ کہ مدینہ میں بھی وہی حالت ہو۔ علاوہ اس کے یثرب کی دو بڑی زبردست قوموں کے درمیان سو سال سے زیادہ عرصہ سے جانی دشمنی چلی آتی تھی اور اب وہ وقت آ گیا تھا کہ ان کا کوئی بادشاہ یا حکم مقرر کر کے ان تمام جدائیوں اور تفرقات کا خاتمہ کیا جائے۔ ماسوائے اس کے وہاں یہودیوں کی بھی ایک بڑی بھاری بستی تھی۔ جس سے دینی اصلاح کے باب میں ایک باب وا نظر آتا تھا۔ ساکنان مکہ روحوں کے بالکل منکر تھے اور آنحضرت کی تعلیم کے روحانی حصّہ کو قبول کرنا ان کے لئے از بس مشکل و دشوار تھا۔ پر یثرب کے باشندوں کی یہ حالت [49] نہ تھی۔ مدت تک یہودیوں کے ساتھ رہنے سہنے اور راہ رسم رکھنے کے باعث وہ لوگ خُدا کی وحدانیت اور پیغمبروں کی معرفت وحی و مکاشفات اور عالم آخرت وغیرہ مضامین سے کسی قدر واقف ہو گئے تھے۔ یثرب سے اسلام نے بہت کچھ حاصل کیا اور اگر حضرت محمد یثرب میں نہ چلے جاتے تو اہل مکہ سے مردود (رد کیا ہوا) ہو کر کہیں ایک سر گرم مست مولا کی طرح زندگی بسر کرتے اور بس۔

پس اگر یثرب کو اسلام کا مولد (پیدا ہونے کی جگہ) اور عرب کی ملکی تدابیر و فتوحات کا مرکز کہیں تو بالکل بجا اور درست ہے۔ چنانچہ اس کو مدینۃ النبی یعنی نبی کا شہر کہتے ہیں۔ اور یہ نام اس پر بالکل صادق (سچا) آتا ہے۔ اس شہر سے جن لوگوں نے آنحضرت کو قبول کیا اور آپ پر ایمان لائے۔ ان کو انصار یعنی حامیوں اور مددگاروں کے خطاب سے ممتاز کیا گیا۔ اہل مدینہ کے خیالات اور ان کے موجودہ عام حالات سے معلوم ہوتا تھا اور امید ہو سکتی تھی کہ آنحضرت کو مایوسی اور شکستہ دلی سے نجات حاصل ہو گی۔ چونکہ قریش کی متواتر مخالفت اور اپنی تمام کوششوں کے بے اثر اور لاحاصل ثابت ہونے سے آنحضرت نہایت رنجیدہ دل اور کبیدہ خاطر (رنجیدہ) تھے۔ اس لئے کچھ تعجب کی بات نہ تھی کہ ہجرت کے خیالات آپ کے دل میں جوش زن ہونے لگے۔ چنانچہ سورہ انعام [50] کے تیرھویں رکوع میں مرقوم ہے۔ **اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ**

یعنی تو چل اس پر جو حکم آوے تجھ کو تیرے رب سے کسی کی بندگی نہیں سوائے اس کے اور جانے دے شرک کرنے والوں کو۔ مذکورہ بالا آیت کے آخری الفاظ آنحضرت کی مکہ سے ہجرت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ آنجناب کے خیالات مطابق اس امر یعنی جواز ہجرت کے بارہ میں وحی نازل ہوئی۔ ۶۲۰ء میں عین اس وقت جبکہ عرب کے بُت پرستوں کے لئے کعبہ کے سالانہ حج کا موقعہ تھا آنحضرت نے چند مدنی مسافروں کو دیکھا اور ان سے سوال کیا کہ تم کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم خزرجی ہیں اور مدینہ میں ہمارے درمیان باہمی حسد و کینہ (عداوت) کی آگ مشتعل ہے۔ شاید

---

[49] اب حضرت محمد کو چند ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جو مکہ میں آپ کو کبھی پیش نہ آئی تھیں قریش کی لاعلمی اور جہالت کے باعث آنحضرت قرآن کو جس صورت میں چاہتے پیش کر سکتے تھے چنانچہ جب آپ نے حضرت نوح اور ابرہیم کی بابت یونہی بے ہودہ اور لغو قصے بیان کئے جو کہ بعض باتوں میں قدیمی کُتب مقدسہ کے قصص کے مشابہ معلوم ہوتے تھے اور جن کی نسبت آپ نے بیان کیا کہ آپ کو یہ قصے خُدا نے حضرت جبرائیل کی معرفت سکھائے ہیں تو اہل مکہ اپنی جہالت و لاعلمی کے باعث ان کی تکذیب نہیں کر سکتے تھے لیکن مدینہ میں وہی لوگ اور وہی کتابیں آپ کی مخالفت کرنے لگیں جن کو آپ مکہ میں اپنی رسالت کی صداقت کے ثبوت میں پیش کیا کرتے تھے Osborn's Islam Under the Arab صفحہ ۴۳

[50] اس سورت میں چند آیات مدنی ہیں کیونکہ ۹۱ ویں آیت میں یہودیوں پر کتمان کلام اللہ کا الزام لگایا گیا ہے اور اس قسم کے الزام اہل مکہ سے کچھ علاقہ نہ رکھتے تھے بلکہ ساکنان مدینہ پر عائد ہوتے تھے ۹۲ ویں آیت میں قرآن کی نسبت یوں مرقوم ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے نازل کی ہے مبارک کتاب ہے اور جو اس سے پیشتر نازل ہوئیں ان کی مصدق ہے اور یہ اسلئے ہے کہ تو شہر ام القریٰ اور اس کے گرد و نواح کے شہروں کے باشندوں کو ڈر سناوے۔ سیل صاحب فرماتے ہیں کہ ام القریٰ کے معنی شہر کی ماں ہے اس سے عرب کا دارالسلطنت یعنی شہر مکہ مراد ہے۔ سیل صاحب نے چند مفسرین کے بیان کو اپنے اس بیان کے ثبوت میں پیش کیا ہے پر قرآن کی عبارت سے زیادہ تر مدینہ کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت محمد نے طائف کی ہجرت کے ایام میں مکہ اور اس کے گرد و نواح کے لوگوں کو وعظ کرنا پسند نہ کیا عموماً جو سورتیں بعد میں نازل ہوئیں ان کی بہت سی آیات پہلی سورتوں میں داخل کر دی گئیں۔ ویری صاحب کی تفسیر قرآن جلد دوم صفحہ ۸۲ اور لائف آف محمد مصنف میور صاحب کی جلد دوم کا صفحہ نمبر ۲۶۸ مطالعہ کیجئے۔

ہمارے لوگوں کو تیرے وسیلہ سے خُدا بلائے۔ جس ایمان کے ہم خود معتقد ہیں۔اس کی طرف ہم ان کو مدعو کرینگے۔اور خُدا ان کو تیری طرف کر دے اور وہ تجھ پر ایمان لے آئیں۔ تو ضرور تو سب پر غالب ہو گا۔ پھر آپ نے ان سے ایک اور سوال کیا جس کے جواب میں انہوں نے کہا۔ کہ ہم یہودیوں سے رابطہ اتحاد رکھتے ہیں۔اور ہماری ان سے دوستی ہے۔اس پر آنحضرت نے اسلام کی تعلیم پیش کی اور قرآن[51] کے چند مقامات انہیں پڑھ کر سنائے۔اب یہ بات بخوبی واضح ہو جائیگی۔ کہ یہ مدنی لوگ جن سے آنحضرت کی مکہ میں ملاقات ہوئی تھی ان میں سے بعض یہودی[52] بھی تھے۔ چنانچہ سورہ یونس جو کہ آخری زمانہ کی مکی سورۃ ہے اس کے چوتھے رکوع میں مندرج ہے۔**بَلْ كَذَّبُواْ بِمَا لَمْ يُحِيطُواْ بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ**۔یعنی بلکہ جھٹلاتے رہے ان سے اگلے سو دیکھ لے کیسا ہوا آخر گنہگاروں کا۔ پھر ایک اور مکی سورۃ یعنی سورہ احقاف کی ۹ ویں آیت میں یوں لکھا ہے۔**إِن كَانَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَكَفَرْتُم بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى مِثْلِهِ فَآمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ**۔یعنی اگر یہ ہو اللہ کے یہاں سے اور تم نے اسکو نہیں مانا اور گواہی دے چکا ایک گواہ[53] بنی اسرائیل کا ایک ایسی کتاب کی پھر وہ یقین لایا اور تم نے غرور کیا اور بے شک اللہ راہ نہیں دیتا گنہگاروں کو۔

اب اتفاق یہ ہوا کہ جب یہودیوں نے جو کہ اپنے مسیح کی آمد کے منتظر تھے۔فرقہ خزرجیہ کے ہاتھ سے تکلیف اٹھائی تو انہوں نے کہا کہ اب وہ وقت بہت قریب آگیا ہے۔ جبکہ خُدا کوئی نبی برپا کریگا اور ہم اس کی پیروی (پیچھے چلنا) کر کے اس کی مدد سے ان کو نیست (برباد) کرینگے۔ جب حضرت محمد نے نبوت کا دعویٰ کیا تو ساکنان مدینہ کو خیال ہوا کہ شاید وہی نبی ہے۔ جس کی آمد کے یہودی منتظر ہیں چنانچہ انہوں نے مناسب جانا کہ آنحضرت کو اپنا طرفدار بنالیں۔ پس یہ لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور آپ کو نبی تسلیم کیا۔ حضرت محمد نے ان نو مریدوں سے درخواست کی کہ مدینہ میں حمایت و محافظت کریں۔انہوں نے عرض کی کہ چونکہ ہمارے لوگوں میں بہت نااتفاقی اور ناموافقت ہے۔اس لئے بہتر ہے کہ ہم مدینہ کو جائیں اور لوگوں کو اسلام کی طرف مدعو کریں۔ اور اگر خُدا ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرے۔اور وہ ایمان لائیں تو اگلے سال حج کے موقعہ پر جو کچھ نتیجہ ہو گا عرض کرینگے۔ جلال الدین السیوطی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان نو مریدوں کو آپ نے سورہ یوسف[54] سنائی۔ ساکنانِ مدینہ یہودیوں سے ملنے جلنے کے باعث حضرت یوسف کے قصہ سے کسی قدر واقف تھے۔ لیکن حضرت محمد نے ان کو اب یہ قصہ اس غرض سے مفصل (تفصیل کے ساتھ) طور پر سنایا کہ ان پر ثابت کرے کہ زمانہ گذشتہ کے قصص و واقعات آپ کو خُدا نے سکھلائے ہیں۔ یہ تمام قصہ محض موسوی بیان کی ایک تمسخر انگیز نقل معلوم ہوتی ہے۔اور ایسا نظر آتا ہے کہ آنحضرت نے یہ تمام کہانی ایسے لوگوں سے سنی تھی جن کو اس کا ٹھیک علم نہ تھا بلکہ کمزور و غیر معتبر روائتوں کے مطابق بیان کرتے تھے۔ غرض یہ سال ان نو مریدوں کی چھوٹی سی جماعت نے مدینہ میں بڑے استقلال و ایمان کے ساتھ بسر کیا۔ دوسرے سال جب پھر حج کا وقت آیا تو مدینہ کے حاجیوں میں ۱۲ انصار تھے۔ انہوں نے بھی آنحضرت سے شرف ملاقات حاصل کیا اور

---

[51] دیکھئے کیلی صاحب کی کتاب محمد و محمدیت صفحہ نمبر ۱۰۸

[52] اس لئے بعض محققین کے نزدیک یہ آیت بلکہ یہ ساری سورت ہی مدنی ہے۔

[53] ان امور کے باب میں آیا یہ ہے کہ گواہ اور آنحضرت کے دیگر یہودی حامی آپ کے مقلدوں اور مومنین میں سے تھے یا وہ غلام تھے جو مکہ میں رہتے تھے یا ساکنان مدینہ میں سے یہودی زائد تھے جن کے ساتھ آنحضرت نے رابطہ اتحاد قائم کر رکھا تھا کچھ ٹھیک پتہ نہیں ملتا۔اور خیال و وہم کے سوا کوئی بات کہی نہیں جاسکتی Muir's Life of Muhammad جلد دوم صفحہ ۱۸۵ معالم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاید ایک یہودی عالم عبداللہ بن سلام تھا جو کہ آنحضرت پر مدینہ میں ایمان لایا۔ کبیر کا بیان ہے کہ یہ آیت مدنی ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ یہ شاہد بھی مدینہ ہی کا یہودی ہو۔ دیکھو خلاصۃ التفاسیر جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۰۱۔

[54] تمام قرآن میں صرف یہی سورۃ ایسی خیال کی جاتی ہے جس میں شروع سے آخر تک ایک ہی مضمون ہو۔

آنحضرت کی تعلیم کو ماننے اور فرمانبرداری کے باب میں انہوں نے تسمیہ (بسم اللہ لرحمٰن الرحیم کہنا) اقرار کیا۔ کہ ہم سوائے واحد خُدا کے اور کسی کی عبادت نہیں کرینگے۔

چوری، زناکاری اور بچہ کشی سے ہمیشہ دست بردار رہینگے۔ ہر حالت میں بدگوئی واتہام (الزام) سے پرہیز کرینگے۔ اور کسی نیک کام میں رسول خُدا کے نافرمانبردار نہ ہونگے۔[55] اس عہد کو عقبیٰ کا عہد اوّل کہتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں آنحضرت کی حمایت و محافظت کا کوئی وعدہ نہیں پایا جاتا۔ اس لئے اس عہد کو عہد النسا بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ عورتوں سے ہمیشہ صرف یہ ہی عہد لیا جاتا تھا۔ اب یہ تمام نومرید نہایت سرگرمی اور جوش سے بھرے ہوئے مدینہ کو واپس گئے۔ اور ان کے ساتھ اس قدر اور لوگ آملے کہ انہیں مکہ سے ایک خاص معلم منگوانا پڑا۔ چنانچہ آنحضرت نے مسعب کو بھیجا اور مدینہ میں اسلام کی بنیاد مستحکم ہوگئی۔ اس سال میں آنحضرت کو بہت کچھ صبر وانتظار سے کام لینا پڑا اور مکہ میں ہر طرح کی ترقی سے آپ ہاتھ دھو بیٹھے اور بالکل مایوس ہوگئے۔ اب آپ کی تمام تر امیدیں انہیں لوگوں پر تھیں جو ساکنان مدینہ میں سے آپ کے نئے مرید بنے تھے۔ لہذا حضرت محمد نے اب مصمم (پکا) ارادہ کرلیا کہ قریش کو اپنی حالت میں مطلق العنان چھوڑ کر ان سے بالکل علیحدہ ہوجائے۔ چنانچہ سورہ انعام کے تیرھویں رکوع میں صاف حکم بھی آگیا۔ **اتَّبِعْ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَوَلَوْ شَاء اللّهُ مَا أَشْرَكُواْ وَمَا جَعَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا وَمَا أَنتَ عَلَيْهِم بِوَكِيلٍوَلاَ تَسُبُّواْ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّهِ فَيَسُبُّواْ اللّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ**۔ یعنی تو چل اس پر جو حکم آوے تجھ کو تیرے رب سے کسی کی بندگی نہیں سوائے اس کے اور جانے دے شریک والوں کو اور اگر اللہ چاہتا تو شریک نہ کرتے اور تجھ کو ہم نے نہیں کیا ان کا نگہبان اور تجھ پر نہیں ان کا حوالہ اور تم لوگ برا نہ کہو جن کو وہ پکارتے ہیں اللہ کے سوا کہ وہ برا کہہ بیٹھیں اللہ کو بے ادبی سے نہ سمجھ کر۔

اب اگرچہ آنحضرت کو سخت جدوجہد کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ تو بھی اب آپ کو کامل (مکمل) یقین تھا اور ذرا بھی شک نہ تھا کہ آخر کار مکہ کے ضدی اور ہٹی (ضدی) لوگ مغلوب ہوجائینگے۔ چنانچہ سورہ ابراہیم کے تیسرے رکوع میں مندرج ہے۔ **وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُواْ لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُم مِّنْ أَرْضِنَآ أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا فَأَوْحَى إِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظَّالِمِينَوَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الأَرْضَ مِن بَعْدِهِمْ ذَلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِي وَخَافَ وَعِيدِوَاسْتَفْتَحُواْ وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ**۔ یعنی اور کہا منکروں نے اپنے رسولوں کو ہم نکال دینگے تم کو اپنی زمین سے یا پھر آؤ ہمارے دین میں۔ تب حکم بھیجا ان کو ان کے رب نے ہم کھپا دینگے ان ظالموں کو اور بسا دینگے تم کو اس زمین میں ان کے پیچھے یہ ملتا ہے اس کو جو ڈر کھڑا ہونے سے میرے سامنے اور ڈرا میرے عذاب کے وعدہ سے۔ اور فیصلہ لگے مانگنے اور نامراد ہو جو سرکش تھا ضد کرنے والا۔

اس یاس و خستگی (مایوسی و ناداری) کی حالت میں جبکہ حضرت محمد تیرہ سال تک متواتر کوشش کرچکے اور سوائے ناکامیابی و جلاوطنی کے اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ تو متخیلہ (سوچنے کی قوت) نے خواب کی صورت میں آنحضرت کے سامنے ایک نقشہ یوں پیش کیا کہ گویا آپ شہر یروشلم کی ہیکل میں ہیں اور وہاں پر آپ نے بزرگوں نبیوں اور فرشتگان کو دیکھا اور پھر عرش (آسمان) معلیٰ پر خُدائے تعالیٰ کے حضور میں پہنچے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت اور ۶۲ ویں آیت میں یوں مرقوم ہے۔ **سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الأَقْصَى الَّذِي بَارَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنْ آيَاتِنَا وَإِذْ قُلْنَا لَكَ إِنَّ رَبَّكَ أَحَاطَ بِالنَّاسِ وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي أَرَيْنَاكَ**۔ یعنی پاک ذات ہے جو لے گیا اپنے بندے

---

[55] Muir's Life Of Muhammad جلد دوم صفحہ ۲۱۶

کو رات ہی رات ادب والی مسجد سے پر لی مسجد تک۔ جس میں ہم نے خوبیاں رکھی ہیں کہ دکھاویں اس کو کچھ اپنی قدرت کے نمونے۔اور جب کہہ دیا ہم نے تجھ سے کہ تیرے رب نے گھیر لیا ہے لوگوں کو اور وہ دکھاوا جو تجھ کو دکھایا ہم نے۔

متذکرہ بالا واقعہ سے شاعروں اور راویوں کو آنحضرت کی معراجی دید شیند (جان پہچان)[56] کے پر جوش بیان کے باب میں نہایت وسیع میدانِ سخن مل گیا ہے۔ان شاعروں اور روایوں نے جو آنحضرت کی حد سے زیادہ تعریفیں کی ہیں۔ان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ آنحضرت پر سچ مچ دل سے ایمان لائے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ ہندوستان میں زمانہ حال کے باہوش اور فہیم علما(عقلمند علما) ان بیانات کو وہمی اور خیالی باتیں سمجھتے ہیں۔ پر متعصب (بے جا حمایت کرنے والے) اور پکے مسلمان اس قسم کے خیالات کو بالکل قابلِ نفرت[57] جانتے ہیں۔

جب پھر دوسرے سال حج کا وقت آیا تو مسعب نے مکہ پہنچ کر اپنی مدینہ کی کامیابی کا مفصل حال آنحصرت سے بیان کیا۔اس حج کی آخری رات کو حضرت محمد نے اپنے مدنی مریدوں سے ملاقات کی۔ان میں ۷۳ مرد اور عورتیں تھیں۔آنحضرت نے ایک تقریر کی اور ان سے یہ درخواست کی کہ آپ کی حمایت و حفاظت کرنے کا عہد کریں۔ چنانچہ انہوں نے آنحضرت کی درخواست کے مطابق عہد کیا۔ یہ عہد عقبیٰ کے عہد ثانی کے نام سے نامزد ہوا۔اب ہم ذیل میں ذکر کرتے ہیں کہ عہد و پیمان کیسا تھا اور اس میں کونسی باتیں شامل تھیں۔ حضرت محمد نے کہا کہ تم اس بات کی قسم کھا کر قبول کرو کہ تم ہر امر میں میری ٹھیک ایسی ہی حمایت و حفاظت کروگے۔ جیسی کہ اپنے زن و فرزند کی کرتے ہو۔ان میں سے ایک سردار نے کہا کہ بے شک ہم اسی خُدا کی قسم کھا کر جس نے تجھے سچ و برحق رسول بھیجا ہے عہد کرتے ہیں۔ کہ ہم اپنے جسم و جان کے برابر تیری حفاظت کرینگے یارسول اللہ ہم کو قبول کیجئے۔ خُدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم جنگی قوم ہیں۔اور شجاعت و بہادری ہم نے اپنے جنگجو اور بہادر آباؤاجداد سے میراث میں پائی ہے۔ پھر ایک اور نے کہا کہ یا رسول اللہ ہمارے اور یہودیوں کے درمیان کئی طرح کے تعلقات اور روابط قائم ہیں۔ اور اب ہم کو یہ تمام تعلقات قطع(کاٹنا۔ختم کرنا) کرنے پڑینگے۔ سو اگر ہم ایسا ہی کریں اور خُدا تجھ کو فتح نصیب کرے۔ تو کیا تو ہم کو یہاں اکیلا چھوڑ کر پھر اپنے وطن مالوف (مکہ) کو چلا یگا؟ آنحضرت نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا خون میرا خون ہے۔اور جس قدر تم کو تکلیف ہوگی اسی قدر مجھ کو بھی ہوگی۔ تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔ جس سے تمہاری [58]دشمنی ہے وہ میرا بھی دشمن ہے اور جس کے ساتھ تمہاری دوستی ہے میں اس کا دوست ہوں۔اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آنحضرت کے دل میں اس وقت امور دینی اور تدابیر ملکی کا امتزاج بہت ترقی پر تھا۔اور آپ کے دل میں جو مدت سے یہ خواہش تھی۔ کہ اہل عرب کو تدابیر ملکی میں متفق اور یک جان کر دے اب پوری ہوتی ہوئی نظر آنے لگی۔ یہ عہد و پیمان زیادہ تر ملکی انتظام اور امور سیاست سے علاقہ (تعلق) رکھتا تھا۔اس سے حفاظت اور عقوبت (دکھ) دونوں باتیں حسب موقعہ ملحوظ (خیال کیا گیا) تھیں۔اور بنیاد یا اس کی ضروری شرائط یہ تھیں کہ بُت پرستی سے دست بردار ہوں اسلام کو قبول کریں۔ اور آنحضرت کی فرمانبرداری و متابعت (پیروی) کو فرض و واجب سمجھیں۔ پہلے حج پر تو آنجناب کے مدنی ہمدردوں نے صرف عورتوں کی سی

---

[56] ان عجائبات کی تشریح کے باب میں کیلی صاحب کی کتاب مسمی بہ محمد و محمدیت کے ۳۰۴ سے ۳۱۴ صفحہ تک مطالعہ کیجئے علاوہ اس کے Devteh's Literary Remains کے ۹۹ سے ۱۱۲ صفحہ تک ملاحظہ کیجئے۔

[57] معراج کے متعلق مسلمانوں کو صرف یہ ماننا چاہئے کہ حضرت محمد نے ایک رویا یا عالم خواب میں یہ دیکھا کہ اس کو مکہ سے یروشلم میں پہنچایا گیا اور وہاں اس نے خُدا تعالیٰ کے بہت سے عجائبات دیکھے (سید احمد کا چھٹہ لیکچر اور اس کا ۳۴ صفحہ) پر اہل سنت کہتے ہیں کہ جو کوئی اس بات کو سچ نہیں مانتا کہ حضرت محمد سچ مچ جسمانی طور پر یروشلم میں گئے کافر ہے کیونکہ وہ قرآن کے صاف اور صریح بیان کا منکر ہے۔ جو کوئی آنحضرت کے یروشلم سے آگے آسمان پر جانے اور ان تمام بیانات کو جو احادیث میں مندرج ہیں سچ نہیں جانتا وہ اگرچہ مسلمان کہلا سکتا ہے پر وہ فاسق یعنی گنہگار ہے۔ علمائے اسلام کی تفاسیر دیکھئے اور سیل صاحب کی کتاب Faith of Islam کا صفحہ نمبر ۲۲۰ مطالعہ فرمائیے۔

[58] یہ بیان کیلی صاحب نے اپنی کتاب محمد و محمدیت کے صفحہ ۳۲۵ میں ابن اسحاق سے اقتباس کیا ہے۔

وفاداری کا عہد کیا تھا۔ لیکن دوسرے حج کے وقت جبکہ ان میں اس قدر ترقی ہوگئی۔ اور ان کی تعداد ستر سے بڑھ گئی۔ تو انہوں نے آپ کی خاطر جنگ وجدل اور ہر طرح کے خطروں کا سامنا کرنے کا عہد کر لیا۔[59] یہ عہد و پیمان ظاہری روش کی تبدیلی کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ اس سے اسلام کے ابتدائی اصول کی بتدریج ترقی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اور شروع کے ان تمام خاص طریقوں کا پتہ ملتا ہے جو آنحضرت کے ہم وطنوں اور غیر ممالک کے لوگوں سے سلوک کرنے کے لئے درکار تھے۔ مکی سورتوں میں سے سب سے آخری سورہ رعد ہے۔ اس میں اوّل سے آخر تک صرف قبیلہ قریش ہی کا بیان ہے۔ اور مکہ میں ان کے ساتھ آنحضرت کی یہ آخری ردو کد (جدوجہد) ہے۔ چونکہ اس سورۃ میں آنحضرت کے معجزات سے قاصر رہنے کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اس لئے اس کو سورہ معذرت بھی کہتے ہیں۔ جب لوگوں نے آپ سے معجزات طلب کئے تو آپ نے ارشاد الہٰی کے مطابق فرمایا کہ میں صرف ڈرانیوالا ہوں۔ منکرین نے کہا جب تک تو خُدا کی طرف سے کوئی صریح نشان نہ لائے ہم تجھ پر ایمان نہیں لاینگے۔ اب آنحضرت کو کوئی معجزہ یا نشان عطا نہ ہوا بلکہ یہ فرمان آیا ہے یعنی کہدے اللہ بچاتا ہے جس کو چاہے اور راہ دیتا ہے اپنی طرف اس کو جو رجوع ہوا۔ (سورہ رعد چوتھا رکوع)۔

اب آنحضرت تیرہ سال بے فائدہ وعظ و نصیحت کرنے کے بعد اہل مکہ کو جنہوں نے آپ کو ہر طرح سے رد کیا زجر و توبیخ (ملامت۔ ڈانٹ ڈپٹ) سنا کر اور ابدی عذاب کی خوشخبری دیکر شہر مکہ سے چل دئے۔

اس کے چند روز بعد آپ نے اپنے تمام مقلدین (پیروکار) کو حکم دیا اور فرمایا۔ کہ سب مدینہ کی طرف ہجرت کر چلو اس شہر میں خُدائے تعالیٰ تم کو برادری اور جائے پناہ بخشیگا۔ قریباً دو ماہ کے عرصہ میں سب کے سب مکہ سے مفرور (بھاگ گئے) ہوگئے۔ لیکن چونکہ اب تک حضرت محمد خود مکہ میں تشریف رکھتے تھے قریش کے لوگ نہایت گھبرا رہے تھے اور ان واقعات کو دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ کہ دیکھیں آخر کیا ہوتا ہے انہوں نے ارادہ کیا کہ آنحضرت کے پاس کوئی اپنا وکیل بھیجیں پر حضرت کسی منصوبہ سے خوف زدہ ہو کر چوری اپنے گھر سے نکل گئے۔ اور رات کے وقت ابو بکر کو ساتھ لے کر شہر مکہ کو چھوڑ گئے۔ اور آنحضرت کی مدنی رہائش کے ایام کی ابتدا میں قبیلہ قریش کی مذکورہ بالا سازش کے باب میں جیسا کہ سورہ انفال کے چوتھے رکوع اور ۳۰ ویں آیت میں مندرج ہے آپ کا یاد آتا ہے اور کہتے ہیں۔ **وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ۔** یعنی اور جب وہ فریب بتانے لگے[60] کافر کہ تجھ کو بٹھادیں یا مار ڈالیں یا نکال دیں اور وہ بھی فریب کرتے تھے اور اللہ بھی[61] فریب کرتا تھا اور اللہ کا فریب سب سے بہتر ہے۔

آنحضرت نے ابو بکر کے ساتھ ایک غار میں پناہ لی۔ اور تین یوم تک یعنی جب تک کفارِ مکہ آپ کی تلاش و جستجو سے دست بردار نہ ہوئے اسی غار میں چھپے رہے کئی سال کے بعد قرآن اس واقعہ کا بیان کرتا ہے۔ کہ کس معجزانہ طور سے خُدا نے خود آنحضرت کو بچایا اور محفوظ رکھا۔ چنانچہ سورہ توبہ کے چھٹے رکوع میں مندرج ہے۔ کہ یعنی اس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت اس کو نکالا کافروں نے دو جانوں سے جب دونوں تھے غار میں۔ جب کہنے لگا اپنے رفیق (ساتھی) کو تو غم نہ کھا اللہ ہمارے ساتھ ہے پھر اللہ نے اتاری اپنی طرف سے تسکین اس پر اور مدد کو اس کی بھیج دی فوجیں کہ تم نے نہیں دیکھیں اور نیچے ڈالی بات کافروں کی اور اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے۔

---

[59] عبید صفحہ ۱۰۹

[60] سیل صاحب چند محدثوں کے بیان کے مطابق فرماتے ہیں کہ قریش نے آنحضرت کو قتل کرنے کے لئے سازش کی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ احادیث قرآنی آیت کا مفصل بیان ہیں۔ ویری صاحب نے جو قرآن کی تفسیر لکھی ہے اس کی پہلی جلد کے ۸۴ صفحہ میں مرقوم ہے کہ آنحضرت کے قتل کی سازش جس کا قرآن و احادیث میں صاف ذکر پایا جاتا ہے زمانہ مابعد کی تمام دشمنی اور حسد و عداوت کی بنیاد اور جڑ ہے۔ Muir's Lif of Muhammad کی جلد دوم کا بھی ۱۲۵ واں صفحہ ملاحظہ فرمائیے۔

[61] اس کی تشریح یوں ہے کہ خُدا نے قریش کی سازش سے آنحضرت کو آگاہ کر دیا۔ قریش کے ہاتھ سے اس کو بچالیا اور قریش کو لا کر جنگِ بدر میں پھنسا دیا (دیکھو تفسیر بیضاوی سے سیل صاحب کا اقتباس)

ثانی اثنین یعنی دو میں سے دوسرا حضرت ابو بکر کے لئے نہایت عزت کا خطاب[62]۔ متصور (تصور کرنے والا) ہونے لگا۔ محمدی احادیث وروایات میں ان تین دنوں[63] کے متعلق بہت سے معجزات مندرج ہیں۔

غار سے نکل کر آخر الامر آپ مدینہ میں وارد ہوئے۔ اور مومنین کی مکہ سے مدینہ کی طرف جو ہجرت شروع ہوئی تھی۔ اب اس کی تکمیل ہو گئی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں آپ کا درخت سعی (جدوجہد) کچھ پھل نہ لایا۔ اور آپ کی تمام محنت رائیگاں گئی۔ اہل مکہ نے خیال کیا کہ اگر ہم آنحضرت کی تدابیر تجاویز کو اختیار کرینگے۔ تو اس کا انجام ملکی انتظار اور امور سیاست میں خود سری اور مطلق العنانی ہو گا۔ لہذا انہوں نے آنحضرت کو مجوزہ تدابیر میں سے کسی کو بھی اختیار نہ کیا۔ لیکن برعکس اس کے مدینہ میں آنحضرت کی یاس آس سے مبدل (نااُمیدی اُمید میں بدل گئی) ہو گئی۔ یہودیوں میں مسیح کی انتظاری کے باعث ایک نبی کے برپا کئے جانے کی عموماً امید کی جاتی تھی۔ قومی عداوت اور خاندانی جھگڑوں سے اہل مدینہ تنگ آئے ہوئے تھے۔ اور ان کی یہ بڑی آرزو تھی کہ کوئی شخص جو صاحبِ قدرت ہو ان کا حاکم بنے اور جنگ وجدل کا خاتمہ ہو۔ حضرت محمد جس مرکب طرز اور ملک وملت کے ممزوجہ طریق کی دھن میں لگے رہتے تھے۔ اور ان کی بڑی آرزو تھی کہ دینی امور اور ملکی انتظام کو ایک بنادیں۔ اب اس کے اجرا و آغاز کا رستہ کھل گیا۔ مکہ میں آنحضرت کی ناکامیابی بحیثیت نبی تھی۔ اور مدینہ میں آپ کی کامیابی اور اقبالمندی ایک سردار اور فاتح کی حیثیت میں تھی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اب تک قرآن میں صرف بُت پرستی کی تردید ابطال کے دلائل اور اہل مکہ کی زجر و توبیخ (ڈانٹ ڈپٹ) اور سرزنش (تنبیہ) کے مضامین نازل ہوتے رہے اور ان سے کچھ معقول استدلال نہ ہوا۔ کیونکہ حضرت محمد نے اپنے آپ کو مرسلانہ جاہ وجلال میں ملبس کر کے خُدا کی طرف سے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو کوسنا شروع کیا اور یہ فتویٰ سنایا کہ وہ نارِ جہنم (جہنم کی آگ) میں ملیں گے۔ مکہ میں قرآن کا مقصد اعلیٰ یہ تھا کہ اوصاف الہیٰ اور صفات ایزدی (خُداوندی) کا اظہار کرے کہ خُدا قادر مطلق۔ ہمہ دان (ہر بات سے واقف) وغیب دان اور وحدہلاشریک ہے۔ عیشِ جنت اور عذاب جہنم کا نہایت صفائی اور صراحت (وضاحت) سے بیان کرتا رہا۔ زمانہ سلف (سابقہ) کے بزرگوں اور انبیاء کے قصص کو سناتا اور حضرت محمد کے دعویٰ پر صحت کی مہر کرتا رہا۔ اپنے آپ کو کلام الہیٰ کے پیرایہ میں پیش کیا۔ اثباتی احکام تاحال بہت مختصر تھے۔ صرف اوقات نماز اور اکل (اکیلا) وشرب (پینے کی چیز)[64] کے متعلق چند قوانین وضع کئے گئے۔ طوافِ کعبہ[65] کے متعلق چند پرانی اور واہیات ونامناسب رسوم سے منع کیا گیا۔ لیکن تاحال اسلامی رسومات تکمیل کو نہیں پہنچیں۔ اسلام کے اخلاقی اور شرعی قوانین اب تک پختہ طور سے معین (مددگار) ومقرر نہیں ہوئے۔

مدنی سورتوں میں مذہبی مسائل کی نسبت مسلمانوں کو زیادہ تر روزمرہ کی زندگی کی بابت ہدایت کی گئی ہے۔ قرآن بحیثیت مجموعی کسی خاص مطلب یا مقصد کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ بلکہ وقتاً فوقتاً حسب موقعہ اور حسب الضرورت نازل ہوتا رہا۔ اب مدینہ میں آنحضرت کی وعظ ونصیحت کی

---

62 سنی فرقہ کے لوگ جو کہ حضرت ابو بکر کی بہت تعظیم وتکریم کرتے ہیں ان کا قول ہے کہ سورہ احقاف کی ۱۴ آیت۔ **وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ** یعنی اور ہم نے تقید کیا ہے انسان کو اپنے ماں باپ سے بھلائی کا پیٹ میں رکھا اس کو اس کی ماں نے تکلیف سے اور جنا اس کو تکلیف سے اور حمل میں رہنا اس کا اور دودھ چھوڑنا تیس مہینے میں ہے یہاں تک کہ جب پہنچا اپنی قوت کو اور پہنچا چالیس برس کو کہنے لگا اے رب میرے میری قسمت میں کر کہ شکر کروں احسان تیرے کا جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے۔ مفسر حسین بیان کرتا ہے کہ حضرت ابو بکر نے ۳۸ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا اور اس کے والدین نے بھی شرف اسلام حاصل کیا اور چالیس برس کی عمر میں اس نے یہ دعا کہ اے خُدا مجھ کو یہ نصیب کر کہ تیرا شکر کروں۔ جس نعمت کے شکر کی توفیق کے لئے حضرت ابو بکر نے دعا کی اس نعمت سے نعمت اسلام (باضافت بیانی) مراد ہے (تفسیر حسینی جلد زدہم صفحہ ۳۲۱) راڈویل صاحب فرماتے ہیں کہ جب ابو بکر خلیفہ بنا اس وقت اس آیت کا یہ مذکورہ مطلب گھڑ لیا گیا ہے۔ نولدیکی صاحب کے نزدیک یہ معاملہ شکوک ہے۔

63 کتاب محمد ومحمدیت مصنفہ کیلی صاحب کا ۳۱۵ سے ۳۲۱ صفحہ تک مطالعہ فرمائیے۔

64 دیکھو سورہ طہ ۱۳۰ آیت وسورہ روم ۱۷ آیت وسورہ ہود ۱۱۵ آیت وسورہ انعام ۱۴۶ آیت سے ۱۴۷ تک وسورہ نحل ۱۱۹ آیت گمان غالب ہے کہ یہ آیت مدنی ہے۔

65 سورہ اعراف کی ۲۷ سے ۳۳ آیت تک ملاحظہ فرمائیے۔

فصاحت وبلاغت جاتی رہی۔ اور اس کی جگہ تدابیر ملکی اور سرداری اور سروری کے آثار نمایاں ہونے لگے۔اب سے لے کر اخلاقی زندگی خانگی مخصوص(گھریلو جھگڑوں)اور صلح جنگ کے مضامین آنحضرت کا ورد زبان تھے۔اور اگران کو قرآن کا قانونی حصّہ قرار دیں تو بجا ہے۔عام نظر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ میں قرآن کا طرز بیان باستثنائے چند مقامات بالکل ویسا ہی ہے۔جیسا کہ ایام مکہ کے تیسرے حصّہ میں تھا اور اعلیٰ انشاء پردازی اور فصاحت وبلاغت سے خالی ہے۔ سورتیں بہت طول وطویل ہیں اور احتمال ہو سکتا ہے کہ وہ ولولہ انگیز چھوٹے چھوٹے مختلف بیانات کا مجموعہ ہوں جو وقتاً فوقتاً وضع کئے گئے اور بعد ازاں ان کو طویل سورتوں میں مرتب کر دیا لیکن ان میں کسی طرح کی ظاہری موافقت اور ترتیب نظر نہیں آتی۔

# باب دوم

## ایامِ مدینہ

اغلباً ماہ جون ۶۲۲ء میں حضرت محمد کھلم کھلا مدینہ میں داخل ہوئے۔ اور قریباً ایک سو پچاس مہاجرین آپ کے ساتھ تھے۔ اہلِ مدینہ اگرچہ آپ کے دعویٰ رسالت پر متفق نہ تھے۔ تاہم انہوں نے آنحضرت کو بخوشی قبول کیا۔ چونکہ ان لوگوں میں خاندانی طرفداری اور قومی عداوت و بغض کی روح بدرجہ غایت (انجام) پائی جاتی تھی اسی لئے آنحضرت نے اپنے آپ کو ان سب سے اپنے بیان کے موافق الہٰی ہدایت پاکر برطرف رکھا۔ اور ان سب سے الگ سکونت اختیار کی۔ نیز آپ نے اس مقام پر ایک مسجد تعمیر کرائی جس سے مدینہ اسلام کا مرکز بن گیا۔ اور پھر اس سے مناسب وقت پر بہت سے ملکی اور معرکہ آرائی کے احکام نافذ ہوئے۔

اس وقت مسلمانوں کی جماعت میں دو قسم کے لوگ شامل تھے۔

اوّل وہ جو کہ حضرت محمد کے ساتھ مکہ سے ہجرت کرکے آئے اور مہاجرین کہلاتے تھے۔

دوم اہلِ مدینہ میں سے وہ لوگ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا اور انصار یا مددگار کہلاتے تھے۔

بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ کہ سورہ نحل[66] میں ان مہاجرین کا بیان پایا جاتا ہے۔ چنانچہ پانچویں رکوع کی ۴۱ ویں آیت میں مرقوم ہے۔ **وَالَّذِينَ هَاجَرُواْ فِي اللّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُواْ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَلَأَجْرُ الآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُواْ يَعْلَمُونَ**۔ یعنی اور جنہوں نے گھر چھوڑا اللہ کے واسطے اور بعد اس کے ظلم اٹھایا۔ البتہ ان کو ٹھکانا دینگے ہم دنیا میں اچھا اور ثواب آخرت کا تو بہت بڑا ہے اگر ان کو معلوم ہوتا۔

پھر ۱۴ رکوع کی ۱۱۹ آیت میں مسطور ہے۔ **ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ عَمِلُواْ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُواْ مِن بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُواْ إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ**۔ یعنی یوں ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر کہ وطن چھوڑا ہے بعد اس کے کہ بچلائے گئے۔ پھر لڑتے رہے اور ٹھہرے

[66] یہ سورۃ بہر کیف آخری زمانہ کی مکی سورتوں میں سے ہے۔ اگر یہ حوالہ درست ہے تو ضرور یہ آیات اس میں ہجرت کے بعد ایزاد کی گئی ہیں۔ جو اس میں متفق نہیں ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ حوالہ ان لوگوں کی طرف ہے جو حبشستان کی طرف چلے گئے تھے۔ مفسر حسین کہتا ہے کہ ۴۳ آیت میں انہیں لوگوں کا ذکر ہے جو حبش کی طرف چلے گئے تھے پر اچھے ٹھکانے سے مدینہ منورہ مراد ہے اور ایک ۱۱۱ آیت میں جس مہاجرت کا ذکر ہے وہ وہی ہے جو مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف تھی چنانچہ لکھا ہے کہ للذین ہاجر وامر آنانہ کہ ہجرت کروند بسوئے مدینہ۔ اس سورۃ میں چند اور آیات بھی مثلاً ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۱۹ صریحاً ایسی ہیں جو کہ مدینہ میں نازل ہوئیں سورہ انفال کی ۷۳ آیت میں مہاجرین کے ان برادرانہ حقوق کا ذکر پایا جاتا ہے لیکن اب اس قسم کے رشتہ کی کچھ ضرورت نہ تھی چنانچہ ۷۶ آیت ایسے حقوق منسوخ کئے گئے اور بمقابلہ مہاجرین اور انصاریوں کے حقیقی رشتہ داروں کو ترجیح دی گئی۔ اس آیت کے بارہ میں مفسر حسین یوں کہتا ہے کہ ایں آیت ناسخ توارث آن جماعت است کہ بہ سبب ہجرت و نصرت میراث میگیرند۔

رہے۔ تیرا رب ان باتوں کے بعد بخشنے والا ہے مہربان۔ چونکہ مدینہ کی آب وہوا نے مہاجرین مکہ کے ساتھ موافقت (برابری) نہ کی۔ اور وہ شب وروز اپنے وطن اور زادبوم (پیدائش کی جگہ) کی آب وہوا کے ازبس خواہشمند تھے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری معلوم ہوا کہ ان کا انصاریوں یعنی مومنین مدینہ سے زیادہ قرابت (رشتہ داری) اور یگانگت (اتحاد) کا رشتہ استوار کرکے ان کو وہاں بود وباش کرنے کی ترغیب وتحریص (خواہش ولالچ) دلائی جائے۔ چنانچہ ان میں ایک برادرانہ دعوت یاضیافت قائم کی گئی۔ اور اس برادرانہ یگانگت کے رشتہ میں دونوں طرف سے پچاس پچاس آدمی شامل ہوئے۔ یہ رشتہ یہاں تک استوار تھا کہ اگر ایک فریق کا کوئی آدمی مرجاتا تھا تو دوسرے فریق سے جو شخص اس کا بھائی قرار دیا گیا تھا متوفی (وفات پایا ہوا) کا وارث ہوتا تھا۔ عرصہ ڈیڑھ سال کے لئے یہی دستور رہا لیکن بعد میں جب اس دستور کی ضرورت نہ رہی تو پھر عام اور معمولی دستور توارث (وراثت) پر عمل درآمد ہونا شروع ہوگیا[67]۔

بعد ازاں مسلمانوں میں ایک عہد وپیمان ہوا جس میں ان کی حفاظت اور انتقام کو ملحوظ رکھا گیا۔ اس عہد وپیمان میں جنگی مقاصد کے لئے یہودیوں کو بھی شامل کیا گیا۔ اس سے غرض عامہ یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کی حمایت کریں۔ اگر ایک مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل کرتا تو اس پر قصاص (انتقام) لازم تھا اور اُس سے انتقام لیا جاتا تھا۔ نیز اس سے یہ بھی غرض تھی کہ مصارف جنگ کے وہ خود متحمل (برداشت کرنے والا) ہوں۔ مدینہ کو مقدس اور غیر مسخر قرار دیں۔ اور جو لوگ ان کی زیر حفاظت ہوں

ان کے لئے حقوق حاصل کریں۔ اور ہر طرح کے جھگڑے قضیہ (تکرار) میں نبی کے فیصلہ پر اکتفا (اتفاق) کریں۔ یہودیوں کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے اور اس پر قائم رہنے کی اجازت تھی۔ پر وہ حضرت محمد کی اجازت کے بغیر لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ اس طرح آنحضرت شروع ہی میں تمام دینی ملکی اور فوجی امور میں حاکم بن بیٹھے۔ اور جہاد ومحاربہ (لڑائی) میں یہودیوں سے مدد لیتے رہے۔ اس عرصہ میں ان کے درمیان صلح وملاپ کو قائم کرنے کے لئے حضرت محمد نے حتیٰ ' المقدور (جہاں تک ہو سکے) بہت کوشش کی۔ جب قبیلہ بنی نجار کا سردار مرگیا تو یہودیوں نے آنحضرت سے درخواست کی۔ کہ ان کے لئے کوئی اس کا جانشین مقرر کرے۔ آپ نے فرمایا کہ بلحاظ رشتہ اناث (عورتیں) تم میرے چچا ہو۔ میں تم ہی میں سے ہوں مجھ کو اپنا سردار جانو۔ عین انہی ایام میں جبکہ آپ کو مدینہ میں اس قدر عروج حاصل تھا یہ مشہور آیت نازل ہوئی۔ **لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ**۔ یعنی دین میں زبردستی نہیں ہے[68]۔ اس آیت میں خواہ منکرین کے سلوک کی طرف اشارہ ہو خواہ مدینہ کے یہودیوں کی طرف لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں ہے۔ کہ یہ اسی

---

[67] ابن اسحاق اور روضتہ الاحباب میں سے جو کچھ کیلی صاحب نے کتاب مسیٰ محمد اور محمدیت کے صفحہ ۳۲۵ میں اقتباس کیا ہے اس کا بمعہ مندرجہ بالا حاشیہ کے ملاحظہ کیجئے۔

[68] اگرچہ سورہ بقرہ ۲۵۶ آیت لکھا ہے لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت صرف ظاہری آزادی کی صورت رکھتی ہے پر فی الحقیقت یوں ہی نہیں ہے۔ اس سے محض یہودی عیسائی مجوس اور صائبین مراد ہیں اور وہ بھی اس حالت میں کہ مطیع ہوں اور جزیہ ادا کریں۔ اہل عرب کے منکرین کے حق میں یہ آیت آیت قتال سے منسوخ ہوگئی۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی ۲۴۴ آیت میں مرقوم ہے کہ جب تک اسلام کو قبول نہ کریں واجب القتل ہیں۔ مفسر حسین کہتا ہے کہ اکراہ نباید کردہ ہیچ کس راز یہود ونصاریٰ ومجوس وصابیان ببر آہ دن اسلام بشرط قبول جزیہ۔ گفتہ اند کہ حکم ایں آیت بآیت قتال۔ قتال منسوخت اور تمام قبائل عرب جزودین اسلام قبول نبود امادہ دیگراں قتال باید کرد تا مسلمان شوند۔ جلد اوّل صفحہ ۴۸۔

پھر خلاصتہ التفاسیر میں یوں مندرج ہے کہ جہاد وقتال اس لئے نہیں ہے کہ خواہ لوگ مسلمان بنائیں جائیں بلکہ اسلام نہ لائیں تو مطیع نہیں۔

وقت کہا گیا تھا جبکہ آپ نے ابھی اس شہر میں رہائش اختیار کی ہی تھی۔ یہ بات ناممکن ہے کہ یہ آیت جنگ بدر کے بعد سنائی گئی ہو جبکہ اس کی عملی طور پر کامل تنسیخ (مکمل منسوخ) ہو چکی تھی۔

اس وقت مدینہ میں جو حالت تھی اس کا مورخ ابنِ اسحاق یوں بیان کرتا ہے۔ کہ جب حضرت محمد نے مدینہ میں امن کی جگہ حاصل کر لی اور مہاجرین نے تقویت کی اور انصاریوں کے معاملات کا بخوبی انفصال (جُدا) ہو گیا۔ تو اسلام کی نہایت استحکام کے ساتھ بنیاد پڑ گئی۔ صوم و صلواۃ کو علانیہ ادا کرنے لگے۔ غربا کے لئے خیرات کے انتظام کئے گئے۔ مجرموں کو سزائیں ملنے لگیں۔ حرام و حلال کا فیصلہ ہو گیا اور اسلام نے خصوصاً انصاریوں میں بہت زور پکڑا۔ فی الحقیقت اس وقت مدینہ میں اسلامی طاقت کو سب پر فوق (سبقت) حاصل تھا۔ تمام مسلمان ہر امر میں مطیع و منقاد (تابع و فرمانبردار) تھے۔ اور جو لوگ تاحال اس سے بر طرف و بر کنار تھے اب ان پر بھی بہت کچھ اثر ہونے لگا۔

اس مقام پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے۔ کہ جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ سب کے سب سچے اور حقیقی ایماندار نہ تھے۔ ظاہراً تو قدیمی حقد و حسد (جلن، عداوت) کو سب فراموش کر بیٹھے تھے پر دراصل یہ معاملہ یوں نہ تھا۔ بہت سے نامی مسلمان پرانی عداوتوں کی یادگار سے اثر پذیر تھے۔ اگرچہ کسی طرح کی صوری مخالفت نظر نہ آتی تھی۔ تو بھی ان کے درمیان طرح طرح کے شکوک اور ہزارہا قسم کی بدگمانیاں تھیں۔ ابن اسحاق انکا یوں بیان کرتا ہے کہ وہ اپنے باپ داداوں کی بُت پرستی سے کچھ دور نہ تھے۔ اور دین اسلام کے وہ دل سے مطلق (بالکل) قائل نہ تھے۔ پر چونکہ زیادہ تر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اسلئے وہ غلبہ اسلام سے مغلوب ہو کر اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے تھے۔ انہوں نے دینِ اسلام محض اپنے بچاؤ کی ایک سبیل (راہ) سمجھا تھا۔ لیکن دلوں میں وہ لوگ اخلاص سے کوسوں دور اور آنحضرت کی تردید میں یہودیوں کے معاون و مددگار تھے۔ اس طرح شروع میں زبردستی ہوتی تھی اور لوگ اسلام قبول کر نیکو موت سے بچنے کا ایک ذریعہ سمجھے تھے۔ ایسے لوگ منافقین یا ریاکار (مددگار) کہلاتے تھے۔ اور ایک عرصہ تک حتی الامکان مخالفت کرتے رہے۔

پھر چند سال بعد حضرت محمد کی طاقت بڑھ گئی اس وقت آپ نے علانیہ ان کی تردید و توہین شروع کر دی۔ سورہ منافقون میں جس کا نازل ہونا ۶ ہجری میں بیان کیا جاتا ہے اس کی آیت ۱، ۲ اور ۷، ۸ ان کے حق میں حضرت محمد کا آخری فتویٰ یوں مندرج ہے۔ **إِذَا**[69] **جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّهُمْ سَاء مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ هُمُ الَّذِينَ يَقُولُونَ لَا تُنفِقُوا عَلَى مَنْ عِندَ رَسُولِ اللَّهِ حَتَّى يَنفَضُّوا وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ**۔ ترجمہ: جب آویں تیرے پاس منافق (ریاکار)۔ کہیں ہم قائل ہیں تو رسول ہی اللہ کا اور اللہ جانتا ہے کہ تو اس کا رسول ہے۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔ انہوں نے رکھی ہیں اپنی قسمیں ڈھال بنا کر۔ پھر روکتے ہیں اللہ کی راہ سے۔ یہ

---

پھر یوں لکھا ہے کہ کافر اسیر یا مرتد کا قتل کرنا بطور سزا دہی کہ ہے (دیکھو جلد اوّل صفحہ ۲۰۲)۔ ایک طرح سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت دینی آزادی کی تعلیم دیتی ہے یا آزادانہ طور پر اپنے خیالات کو بیان کرنیکی اجازت دیتی ہے لیکن اس کا حاصل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ چند قومیں جزیہ ادا کرنے اور ملکی مذہب کی مجوزہ شرائط کے لگا رکھنے سے قتل کی سزا سے مخلصی حاصل کر سکیں۔

[69] سورہ منافقون کی ۱، ۲ اور ۷، ۸ آیات۔

لوگ جو کرتے ہیں برے کام ہیں۔ وہی ہیں جو کہتے ہیں اللہ مت خرچ کرو ان پر جو پاس رہتے ہیں رسول اللہ کے۔ جب تک کھنڈ جاویں۔ اور اللہ کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے لیکن منافق نہیں بوجھتے۔ کہتے ہیں البتہ اگر ہم پھر گئے مدینہ کو تو نکال دیگا جس کا زور ہے وہاں سے بے قدر لوگوں کو۔ اور زور اللہ کا ہے اور اس کے رسول کا اور مومنین کا لیکن منافق نہیں سمجھتے۔

مدینہ یہودی لوگوں کی ایک بڑی بھاری اور سرکردہ جماعت تھی اور ابتدا میں حضرت محمد کی ان پر بڑی امیدیں تھیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ لوگ الہام و وحی کے باب میں بہت کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ حضرت محمد نے بیان کیا ہے کہ اسلام یہودی اور مسیحی دین کے سب اپنی اصلیت میں ایک ہی اصل یعنی کتب سماوی (آسمانی کتابوں) پر مبنی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کو یہ امید تھی کہ یہودی لوگ اسلام کو من جانب اللہ قبول و تسلیم کرینگے۔ اور کم زکم آنحضرت کو اہل عرب کے لئے رسول من اللہ مان لینگے۔ جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ آپ نے ان کے لئے بعض حقوق قائم رکھے اور ان کے ساتھ آپ کا ایسا سلوک تھا جیسا ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جن سے باہمی عہد و پیمان ہو۔ علاوہ ازیں دینی امور میں آپ نے یہودیوں کو بہت سی باتوں میں آزاد اور مطلق العنان (آزاد) چھوڑا ہوا تھا۔ نولدیکی صاحب[70] فرماتے ہیں سورہ عنکبوت کے پانچویں رکوع اور اس کی آیت ۴۶ میں جو کہ مکی سورتوں میں آخری زمانہ کی خیال کی جاتی ہے۔ اسی وقت کا ذکر پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں یوں مرقوم ہے۔ کہ **وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ**[71] یعنی جھگڑا نہ کرو کتاب والوں سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو۔ مگر جو ان میں بے انصاف ہیں۔ یہ بات یوں ہی ہو یا نہ ہو پر اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس وقت حضرت محمد اہل یہود سے دوستی پیدا کرنے کے لئے بہت ہی فکر مند تھے اور کئی طرح سے آپ نے ان کو اپنا طرفدار اور حامی بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ جس طرح یہودی لوگ یروشلم کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے۔ آپ نے بھی انہیں کی طرح یروشلم کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنی شروع کردی۔ عید کفارہ پر جو کہ مہینے کی دسویں تاریخ کو ہوتی تھی یہودی لوگ روزہ رکھتے تھے۔ اور قربانیاں گذرانتے تھے۔ حضرت محمد نے بھی اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ وہ بھی ایسا ہی کیا کریں۔ اس طرح آنحضرت نے بہت سے یہودیوں کے لئے اسلام میں داخل ہونا آسان کردیا۔ ان اشخاص سے آنجناب کو بہت فائدہ پہنچا۔ اور ان سے آپ نے سلف کی کتب سماوی کی نسبت بہت کچھ سیکھا۔ حتیٰ کہ یقین کرنے لگے کہ ان کتابوں میں آپ کی آمد و تشریف آوری کی نسبت پیشین گوئیاں مندرج ہیں۔ بارہا ان لوگوں کا حوالہ دیا گیا ہے اور ان کو آپ اپنی رسالت کے گواہوں کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ پر باوجود اس کے اکثر یہودیوں نے آپ کو بمعہ آپ کے دعاوی کے قبول کرنے سے انکار کیا۔ کیونکہ جس نبی کے وہ

---

[70] دیکھو نولدیکی صاحب کا گشختی دس قرآن صفحہ ۱۱۶۔

[71] اس آیت سے کہ **وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ** مفسرین اسلام بہت گھبراہٹ میں ہیں حسین بیان کرتا ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے ساتھ حضرت محمد نے عہد و پیمان کیا تھا یعنی وہ لوگ جو کہ اسلام سے معاہدہ رکھتے تھے اور جزیہ دیتے تھے یعنی ضمی تھے چنانچہ حسین کے یہ الفاظ ہیں کہ یا اہل الکتب یعنی کسانیکہ در عہد شما اند یا جزیہ قبول کردہ اند۔ بعض عربی مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت کے یہ معنی نہیں کہ اہل کتاب سے نرمی کی جاوے بلکہ ان سے خائف ہو کر ایسا فرمایا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے یعنی اہل کتاب (یہودی) عبرانی زبان میں توریت کو پڑھتے ہیں اور اہل اسلام کے لئے عربی زبان میں اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ پس پیغمبر نے فرمایا کہ اہل کتاب کو جھوٹا یا سچا کچھ نہ کہو اور صرف یہ کہو کہ ہم ایمان لاتے ہیں ساتھ اللہ کے اور ساتھ اس چیز کے جس کو اس نے نازل فرمایا۔

پھر یوں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی جونہی کہ مردہ کے پاس سے گذرا اس نے حضرت محمد سے کہا کہ اے محمد کیا یہ مردہ بولتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اہل کتاب سے نہ موافقت رکھو اور نہ مخالفت بلکہ یوں کہ ہم ایمان لاتے ہیں ساتھ اللہ کے اور اس کے فرشتوں اور اس کے کلام اور اس کے رسولوں کے اگر ان کا کہنا جھوٹ ہے تو تم اس کو مت مانو اور اگر سچ ہے تو تم نہ جھٹلاؤ اور ایسی جگہ اختیار کرو جو انکی موافقت اور مخالفت دونوں سے الگ رکھے۔ دیکھئے گائیگر کی کتاب یہودیت اور اسلام کا صفحہ ۱۵ اور ۱۶۔

بعض کہتے ہیں کہ سورہ توبہ کی پانچویں آیت سے اس کی تنسیخ ہو گئی ہے اور سورہ توبہ سوائے ایک کے قرآن کی ساری سورتوں سے آخر کی ہے اور یہ اس وقت نازل ہوئی تھی جبکہ یہودیوں کی مخالفت حد سے گذر گئی تھی۔ چنانچہ سورہ توبہ کی اس پانچویں آیت میں لکھا ہے فاقتلوا المشرکین حیث وجد تموھم یعنی قتل کرو مشرکوں کو جہاں کہیں تم انہیں پاؤ۔ اس آیت کو آیت السیف کہتے ہیں لیکن اس امر کا تحقیق معلوم کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ اس سے برہمنوں یا مسیحیوں کی طرف جو مشرک خیال کئے جاتے تھے اشارہ ہے تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس سے خاص کر وہ آیت منسوخ ہو جو یہودیوں کے حق میں نازل ہوئی تھی۔

انتظار میں تھے وہ داؤد کی نسل سے آنے والا تھا۔ لہذا وہ آپ کے سخت مخالف ہوگئے۔ اور آپ کے دعووں کے مطلق شنوا (سننے والے) نہ ہوئے۔ کیونکہ ان کی کتاب کے مطابق آپ کے حق میں ان کا یہی فیصلہ ہو سکتا تھا تاہم یہ بات صاف ظاہر ہوگئی کہ جوں جوں اسلام ترقی کرتا جائے گا دوسرے ادیان ومذاہب کا تنزل (زوال) لابدی (یقینی) ہوگا۔ اہل عرب میں بہت سے بُت پرست مدینہ سے بھاگ گئے۔ اور ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ "اس حالت میں کئی یہودی معلم اور ربی حضرت محمد کے سخت دشمن ہوگئے۔ چونکہ خُدا نے اہلِ عرب میں سے اپنے لئے ایک رسول چُنا اس لئے وہ حسد سے بھر گئے پھر بھی بعض یہودیوں نے خائف ہو کر حضرت محمد اور اس کے نئے دین کو قبول کر لیا۔

مورخین اسلام لکھتے ہیں کہ یہ محض ظاہری طور پر پناہ لینے کے لئے مسلمان ہوئے تھے۔ پر درحقیقت انہوں نے اسلام کو قبول نہیں کیا تھا بلکہ ریاکار اور منافق تھے۔ اسی طرح نہ صرف ان لوگوں میں سے جو اہل عرب سے مسلمان ہوئے تھے بلکہ ان میں بھی جنہوں نے اہل یہود سے اسلام قبول کیا تھا منافق تھے۔ یہودیوں کی دشمنی اور مخالفت آنخضرت کے حق میں ایسی ہی مضر اور خطرناک تھی جیسی بُت پرستوں کی۔ کیونکہ مقدم الذکر یعنی اہل یہود آپ کو صرف لڑائی اور ملکی معاملات میں ہی نقصان نہیں پہنچاتے تھے۔ بلکہ انہوں نے اسلام کی سخت نکتہ چینی اور طعن وتشنیع (طنز وطعنہ) کے جان دوز تیروں سے بھی حضرت کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔[72]

سورہ انعام زمانہ اخیر کی مکی سورتوں میں سے ہے پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ۹۱ آیت ضرور بالضرور مدینہ میں اضافہ کی گئی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں یوں مسطور ہے۔ **قُلْ مَنْ أَنزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاء بِهِ مُوسَى نُورًا وَهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا وَعُلِّمْتُم مَّا لَمْ تَعْلَمُواْ أَنتُمْ وَلاَ آبَاؤُكُمْ قُلِ اللّهُ۔** یعنی پوچھ تو کس نے اتاری وہ کتاب جو موسیٰ لایا روشنی اور ہدایت لوگوں کے واسطے۔ جس کو تم نے ورق ورق کر کے دکھایا۔ اور بہت کچھ رکھا۔ اور تم کو اس میں سکھایا جو نہ جانتے تھے تم اور نہ تمہارے باپ دادا کہ اللہ نے اتاری پھر چھوڑ دے ان کو اپنی بہک میں کھیل کریں۔

اس مندرجہ بالا آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضرت محمد نے ان کے کاغذوں پر لکھنے کے باعث ان پر توریت کی تحریف (تبدیلی) کا الزام نہیں لگایا۔ بلکہ ان پر آنخضرت نے جو الزام لگایا وہ یہ تھا کہ وہ توریت کے بعض حصص کو اس غرض سے چھپا رکھتے تھے کہ کسی طرح آپ کے دعویٰ[73] کے تحت میں نہ آئیں۔ پھر سورہ بقرہ جو کہ ۲ ھجری میں[74] میں مدینہ میں نازل ہوئی تھی۔ یہودیوں کے برخلاف کئی مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ اگرچہ اس امر کی نسبت طول طویل تشریح کی گنجائش نہیں۔ تاہم سورہ بقرہ اور بعض اور سورتوں کے چند مقامات سے مختصر حوالہ جات پیش کرنے سے یہ معاملہ صاف ہو جائیگا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے پانچویں رکوع کی آیت ۴۰ تا ۴۲ میں یوں مرقوم ہے۔ **يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُواْ نِعْمَتِيَ الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُواْ بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ وَآمِنُواْ بِمَا أَنزَلْتُ مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَكُمْ وَلاَ تَكُونُواْ أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ وَلاَ تَشْتَرُواْ بِآيَاتِي ثَمَناً قَلِيلاً وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ وَلاَ تَلْبِسُواْ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُواْ الْحَقَّ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ۔** یعنی اے بنی اسرائیل یاد کرو میرا احسان جو میں نے

---

[72] دیکھو نولدیکی صاحب گشختی دس قرآن صفحہ ۱۲۵۔

[73] راڈویل صاحب فرماتے ہیں کہ محمد صاحب نے یہود ونصاریٰ پر پاک نوشتوں کی تحریف کا الزام نہیں لگایا بلکہ اُس نے یوں کہا کہ یہہ لوگ کلام اللہ کی تفسیریں غلط کرتے ہیں تاکہ مجھ کو جھٹلاویں اور میرے دعاوی کو قبول نہ کریں۔ محمد صاحب کے تمام اقوال اور فتوے جو کہ یہود ونصاریٰ اور اُن کی کتابوں کے حق میں ہیں اُن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک اس کو ان کی نسبت علم تھا وہ اُن کو صحیح اور درست قرار دیتا ہے دیکھو راڈویل صاحب کا قرآن ۴۳۴

[74] اِس سورت کے بہت سے حصے مکہ ہیں اور خصوصاً نفس مضمون سے پتہ لگتا ہے کہ اُنیسویں آیت سے لے کر سینتسویں آیت تک ایام سے تعلق رکھتی ہے کیونکہ اُنیسویں آیت میں الفاظ يَاأَيُّهَا النَّاسُ یعنی اے لوگو پائے جاتے ہیں اور اہل مدینہ کے حق میں آپ نے الفاظ کو استعمال نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ان کو یعنی يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اے ایمان والوں کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

کیا تم پر اور پورا کرو قرار میرا تو میں پورا کروں قرار تمہارا اور میرا ہی ڈر رکھو۔ اور مانو جو کچھ میں نے اُتارا سچ بتاتا تمہارے پاس والے کو۔ اور مت ہو تم پہلے منکر اس کے اور نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچتے رہو اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور یہ کہ چھپاؤ سچ کو جان کر۔

سورہ بقرہ میں خُدا تعالیٰ کے ان احسانات کا بیان جو اس نے بنی اسرائیل پر موسیٰ کی معرفت اور بیابان میں کئے نہایت طوالت (درازی) کے ساتھ مندرج ہے۔ چنانچہ ۵۹ آیت میں جس پر اکثر بہت کچھ مناظرہ و مباحثہ ہوتا ہے یوں لکھا ہے کہ **إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَالَّذِينَ هَادُواْ وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحاً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ**۔ یعنی یوں ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہود ہوئے اور نصاریٰ اور صائبین[75] جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور کام کیا نیک تو ان کو ہے ان کی مزدوری اپنے رب کے پاس اور نہ ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھاویں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مذاہب یکساں ہیں اور عوام الناس کا خیال یہ نہیں ہے کیونکہ بعض مفسرین کے نزدیک من امن باللہ والیوم الاخر و عمل صالحاً کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں نے اب تک اسلام قبول نہیں کیا وہ اپنی ناراستی سے باز آویں اور اسلام کو قبول کریں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ سورہ آل عمران کی ۷۹ آیت سے یہ آیت منسوخ ہو گئی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں یوں مرقوم ہے کہ **وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ** یعنی اور جو کوئی چاہے سوائے اسلام کی حکم برداری کے اور دین سو اس سے ہر گز قبول نہ ہو گا۔ اور وہ آخرت میں خراب ہے۔

جو یہودی مسلمان ہو گئے تھے ان میں سے بعض کی ریاکاری اور نفاق کا بیان سورہ بقرہ کی ۷۱ آیت سے ۷۵ تک یوں مندرج ہے **وَإِذَا لَقُواْ الَّذِينَ آمَنُواْ قَالُواْ آمَنَّا وَإِذَا خَلاَ بَعْضُهُمْ إِلَىَ بَعْضٍ قَالُواْ أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ أَفَلاَ تَعْقِلُونَ أَوَلاَ يَعْلَمُونَ أَنَّ اللّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لاَ يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلاَّ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلاَّ يَظُنُّونَ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَـذَا مِنْ عِندِ اللّهِ لِيَشْتَرُواْ بِهِ ثَمَناً قَلِيلاً فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُونَ وَقَالُواْ لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلاَّ أَيَّاماً مَّعْدُودَةً قُلْ أَتَّخَذْتُمْ عِندَ اللّهِ عَهْداً فَلَن يُخْلِفَ اللّهُ عَهْدَهُ أَمْ تَقُولُونَ عَلَى اللّهِ مَا لاَ تَعْلَمُونَ بَلَى مَن كَسَبَ سَيِّئَةً وَأَحَاطَتْ بِهِ خَطِيئَتُهُ فَأُوْلَـئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ وَالَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ أُوْلَـئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ**۔ یعنی اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے۔ اور جب اکیلے ہوتے ہیں ایک دوسرے پاس کہتے ہیں۔ کہ تم کیوں کہہ دیتے ہو ان سے جو کھولا ہے اللہ نے تم پر کہ جھٹلاویں تم کو اسی سے تمہارے رب کے آگے کیا تم کو عقل نہیں؟ کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو چھپاتے ہیں اور جو کھولتے ہیں؟ اور ایک اُن میں ان پڑھ ہیں۔ نہیں خبر رکھتے کتاب[76] کی

---

[75] صابئین کی نسبت مفسرین کا عموماً یہ خیال ہے کہ یہ ایک ایسی جماعت تھی جس کے مذہب میں یہودیت اور مسیحیت دونوں مذہبوں کی باتیں ملی ہوئی تھیں۔ وہ ایک واحد خُدا کی پرستش کرتے تھے (اگرچہ بعض کی رائے اس امر میں اتفاق نہیں کرتی) زبوروں کی تلاوت کرتے اور مکہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے اور فرشتوں کو بھی پوجتے تھے۔ اس ساری آیت کا اصل مطلب اور لب لباب یوں بیان کیا جاتا ہے کہ کوئی مسلمان یا کتابی یا غیر کتابی جب ایمان لائے اچھے کام کئے اسے خوف نہیں۔ دیکھو خلاصۃ التفاسیر جلد اوّل صفحہ ۴۰۔ راڈویل صاحب کے قرآن صفحہ ۴۳۷ میں یوں مندرج ہے کہ صائبین سے وہ مسیحی مراد ہیں جو یحییٰ کے شاگرد تھے۔ صائبین کے حالات مفصل طور پر دریافت کرنے کے لئے ایس۔ لین پول کی کتاب المطالعہ فی المسجد کو ۲۵۲ سے ۲۸۸ صفحہ تک مطالعہ فرمائے۔ علمائے اسلام کہتے ہیں کہ اس آیت نے ان دینوں کو منسوخ کر دیا جو گذر گئے یا پیدا کئے جائیں۔ خلاصۃ التفاسیر جلد اوّل کے صفحہ ۲۷۱ کو ملاحظہ کیجئے۔

[76] توریت شریف

مگر باندھ لی اپنی آرزوئیں اور ان پاس نہیں مگر اپنے خیال۔ سو خرابی ہے ان کی جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے پھر کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے کہ مول لیویں اس پر مول تھوڑا۔ سو خرابی ہے ان کو اپنے ہاتھ کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کو اپنی کمائی سے۔ اور کہتے ہیں کہ ہم کو آگ نہ لگیگی مگر کئی دن گنتی کے۔ تو کہہ کیا لے چکے ہو اللہ کے یہاں سے قرار۔ تو البتہ خلاف نہ کریگا اللہ اپنا قرار۔ یا جوڑتے ہو اللہ اپنا پر جو معلوم نہیں رکھتے۔ کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے سو وہی ہیں لوگ دوزخ کے وہ اسی میں رہ پڑے۔

جو لوگ اس بات پر جمے اور کہتے ہیں کہ پاک نوشتوں میں حضرت محمد کے حق میں کچھ بھی درج نہیں ہے ان کے حق میں آپ نے اسی سورۃ میں ذرا آگے چل کر یوں فرمایا کہ یعنی کیا مانتے ہو تھوڑی کتاب اور منکر ہوتے ہو تھوڑی سے پھر کچھ سزا نہیں اس کی جو کوئی تم میں یہ کام کرتا ہے۔ مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں اور قیامت کے دن پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں۔

جب انہوں نے قرآن کو من جانب اللہ قبول نہ کیا تو ان کی ضد سے تنگ آکر آپ نے سورہ بقرہ کے ۱۱ رکوع میں یوں عتاب (غصہ) فرمایا کہ **بِئْسَمَا اشْتَرَوْاْ بِهِ أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُواْ بِمَا أَنزَلَ اللّهُ بَغْياً أَن يُنَزِّلُ اللّهُ مِن فَضْلِهِ عَلَى مَن يَشَاء مِنْ عِبَادِهِ فَبَآؤُواْ بِغَضَبٍ عَلَى غَضَبٍ** یعنی برے مول خرید کیا اپنی جان کو کہ منکر ہوئے اللہ کے اُتارے کلام سے اس ضد پر کہ اُتارے اللہ اپنے فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے سو کمالائے غصہ پر غصہ [77]

پھر سورہ بقر کے ۱۶ رکوع کی آیت ۱۳۷ میں اس وعدہ کا ذکر ہے۔ جو خُدا نے محمد سے روگردان ہونے والوں کی مخالفت کے مقابلہ میں آپ کی حفاظت کے بارہ میں کیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ **فَإِنْ آمَنُواْ بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَواْ وَّإِن تَوَلَّوْاْ فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ**۔ یعنی پس اگر وہ بھی یقین لاویں جس طرح تم یقین لائے راہ پاویں اور اگر پھر جاویں تو وہی ہیں ضد پر۔ سو اب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ اور وہی ہے سنتا جانتا۔ پھر اسی رکوع ۱۴۰ آیت میں ان پر یہی الزام لگایا گیا ہے۔ کہ پاک نوشتوں میں آنحضرت کی آمد کی نسبت جو کچھ درج تھا اس کو انہوں نے درج نہیں کیا بلکہ اس کو پوشیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ **وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَتَمَ شَهَادَةً عِندَهُ مِنَ اللّهِ**۔ یعنی اور اس سے ظالم کون جس نے چھپائی گواہی جو تھی اس پاس اللہ کی۔ پھر سورۃ البینہ جس کو ترتیب کے لحاظ سے سورہ بقرہ کے بعد کی سمجھنا چاہئے اس کی پہلی تین آیات میں یوں مذکور ہے۔ **لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ رَسُولٌ مِّنَ اللَّهِ يَتْلُو صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءتْهُمُ الْبَيِّنَةُ**۔ یعنی نہ تھے وہ لوگ جو منکر ہیں کتاب والے اور شریک والے باز آتے جب تک کہ پہنچی ان کو کھلی بات ایک رسول کا پڑھنا ورق پاک اس میں لکھیں کتابیں مضبوط اور پھوٹے وہ جن کو ملی ہے کتاب سو جب آچکی ان کو کھلی بات [78]

---

[77] غضب علی غضب کے بیان میں مفسر مجاہد کا قول ہے کہ پہلا غضب ان پر ہے جنہوں نے توریت شریف کو رد کیا اور دوسرا غضب ان پر جو حضرت محمد کی رسالت پر ایمان نہ لائے خلاصۃ التفاسیر جلد اوّل کا صفحہ نمبر ۵۱ مطالعہ کیجئے۔

مفسرین حسین فرماتے ہیں کہ اوّل غضب ان پر ہے جنہوں نے مسیح اور اناجیل کو قبول نہیں کیا اور دوسران پر جو حضرت محمد اور قرآن کو من جانب اللہ جان کر ایمان نہ لائے۔ تفسیر حسینی جلد اوّل کا صفحہ نمبر ۱۶ ملاحظہ کیجئے۔

[78] اکثر مفسرین اس کا یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ لوگ حضرت محمد کی تشریف آوری سے پہلے ایک نبی کی آمد کے منتظر تھے کہ جب وہ آوے تو اسکی تقلید و پیروی کریں جب آنحضرت آئے تو بعضوں نے مان لیا اور بعض منکر ہو گئے۔ چنانچہ تفسیر جلالی اور حسینی میں یوں لکھا کہ پیش از بعثت آنحضرت ہمہ مجمع بودند بر تصدیق دے وبعد از انکہ مبعوث شد مختلف شدند بعضے گرویدند بوے و برخے کافر شدند۔

پھر سورہ آل عمران کے ۸ رکوع میں اسی خیال کے مطابق الزام لگایا گیا ہے۔ چنانچہ یوں مرقوم ہے۔ **وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِندِ اللهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ**۔ یعنی اور ان میں سے ایک لوگ ہیں کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب کہ تم جانو وہ کتاب میں ہے اور وہ نہیں کتاب میں اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے۔ اور وہ نہیں اللہ کا کہا اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں جانکر۔

پھر سب سے آخری سورۃ یعنی سورۃ المائدہ کے تیسرے رکوع میں یوں مسطور ہے یعنی ہیں کلام کو اپنے ٹھکانے سے اور بھول گئے ایک فائدہ لینا اس نصیحت سے جو ان کو کی تھی۔

نیز مرقوم ہے[79] **يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ تُخْفُونَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ قَدْ جَاءكُم مِّنَ اللهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُّبِينٌ يَهْدِي بِهِ اللهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلاَمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنِ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ**۔ یعنی اے کتاب والو آیا ہے تم پاس رسول ہمارا۔ کھولتا ہے تم پر بہت چیزیں جو تم چھپاتے تھے کتاب کی اور در گذر کرتا ہے بہت چیزوں سے تم پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب بیان کرتی جس سے اللہ راہ پر لاتا ہے جو کوئی تابع ہو اس کی رضا کا بچاؤ کی راہ پر اور ان کو نکالتا ہے اندھیرے سے روشنی کی طرف اپنے حکم سے اور ان کو چلاتا ہے سیدھی راہ۔

ان مذکورہ بالا آیات میں یہود نصاریٰ پر جس قدر الزامات لگائے گئے ہیں۔ ان سے ہرگز ہرگز یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یہود و نصاریٰ نے پاک نوشتوں میں تحریف و تبدلات کئے بلکہ ان پر صرف یہی الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے توریت و انجیل کی بہت سی باتوں کو جنہیں حضرت محمد اپنی بشارت کی دلیل گردانتے تھے پوشیدہ رکھا اور ظاہر نہیں کیا۔ اس میں بھی محض اس کی امر طرف اشارہ تھا کہ توریت و انجیل میں جو کچھ حضرت محمد کے حق میں مندرج تھا اس کو انہوں نے پوشیدہ رکھا۔

اس امر کا ہرگز ہرگز کوئی ثبوت بیان نہیں کیا گیا کہ توریت و انجیل کی تحریف ہو گئی اور اب وہ حقیقی اور قابلِ عمل نہیں ہے بلکہ نہایت صفائی اور صراحت (وضاحت) سے اس امر کا بیان اس کے برخلاف اور توریت و انجیل کی صحت درستی پر دال (نشان) ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں مرقوم ہے کہ ترجمہ نازل کیا ہم نے توریت کو اور اس میں ہدایت اور نور ہے۔ اور نیز یہ کہ اے کتاب والو تم کچھ راہ پر نہیں جب تک نہ قائم کرو توریت اور انجیل اور جو کچھ تم کو اترا[80] تمہارے رب سے۔

اب مذکورہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ توریت و انجیل پر بھی قرآن کی طرح ایمان لانا اور عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر توریت و انجیل کی تحریف و تنسیخ (بدل دینا و منسوخ کرنا) ہو جاتی تو قرآن ہرگز ہرگز ان کو صحیح اور قابل قبول بیان نہ کرتا۔ درحقیقت ان کُتبِ مقدسہ کی صحت و درستی اور

---

[79] اس جگہ یہ الزام لگایا گیا ہے کہ یہودی توریت شریف کے ان حصص اور آیات کو پوشیدہ رکھتے تھے جنہیں حضرت محمد کی تعریف مندرج تھی اور نصاریٰ اس پیشگوئیاں کو چھپاتے تھے جو مسیح نے اپنے بعد ایک پیغمبر یعنی آنحضرت کے من جانب اللہ آنے کی نسبت کی تھی۔ مما کنتم تکمنون کے معنی وہی ہیں جو کہ یہود و نصاریٰ کے تعلق میں بیان کئے گئے ہیں چنانچہ تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۴۰ میں یوں مرقوم ہے کہ ازانچہ ہستید کہ آنرا پنہاں میدارید من الکتب چوں نعت محمد مصطفیٰ و آیت رجم واز نجیل چون بشارتِ عیسیٰ بہ احمد۔

[80] قرآن۔

حفاظت من اللہ کی گواہی حضرت محمد خود قرآن سے سورہ مائدہ کے ۷ رکوع میں یوں پیش کرتے ہیں۔ **وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا**[81] **عَلَيْهِ**۔یعنی اور تجھ پر اُتاری ہم نے کتاب تحقیق سچا کرتی اگلی کتابوں کو اور سب پر شامل۔

پس اب صاف ظاہر ہے کہ توریت وانجیل کی حضرت محمد سے پہلے تحریف نہیں ہوئی۔ کیونکہ قرآن ان کی تائید (حمایت) کرتا ہے اور اگر ازروئے اسلام بھی بہ نظر تعمق (غور کرنا) دیکھا جائے۔ توجب قرآن توریت وانجیل کی حفاظت ونگہبانی کا دعویٰ کرتا ہے۔ تو ان میں کسی طرح کی تحریف وتخریب (تبدیلی وخرابی) کا وقوع میں آنا ہرگز ہرگز ثابت نہیں ہوتا بلکہ ناممکن ہے۔ جو حامیانِ اسلام اس معاملہ میں تلخ گوئی پر اُتر پڑتے ہیں وہ ایک طرح سے صاف اقرار کرتے ہیں۔ کہ وہ قرآن سے بالکل ناواقف ہیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ قرآن کی از حد بے عزتی اور توہین کا باعث ہوتے ہیں۔ کیونکہ قرآن توریت وانجیل کی محافظت کا ذمہ وار ہوتا ہے۔ اور یہ ان کی تحریف وتخریب پر زور دیتے ہیں۔ یا یوں کہیں کہ قرآن کی محافظت اور تکذیب (جھٹلانا) کرتے ہیں۔

لہذا اگر کُتبِ مقدسہ تحریف ہو گئیں ہیں تو قرآن اپنے فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہا۔ یا یوں کہیں کہ قرآن نے جو کچھ توریت وانجیل کی حفاظت ونگہبانی کا دعویٰ کیا وہ محض دعویٰ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت محمد کو کُتبِ مقدسہ کی صحت ودرستی کے باب میں کسی طرح کا شک وشبہ نہ تھا۔ لیکن جب آنحضرت نے دیکھا کہ اب یہودیوں سے کچھ غرض ومطلب نہیں ہے تو مناسب جانا کہ ان کو غیر معتبر قرار دے۔ یہ امر نہایت قابل توجہ اور غور کے لائق ہے۔ کہ بائبل شریف کی تحریف (بدل دینا) وتخریب کے باب میں جس قدر آیات قرآن میں پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب مدینہ میں نازل ہوئی تھیں۔

جب یہودیوں کو اس طرح زجر وتوبیخ (لعنت وملامت) کی گئی اور ان کو اپنے مطالب ومقاصد کے لئے غیر ضروری سمجھ کر رد کر دیا۔ تو پھر آنحضرت کو ان کی مطابقت وموافقت کی کچھ ضرورت نہ معلوم ہوئی چنانچہ آپ نے یروشلم کی جگہ پھر مکہ کو قبلہ قرار دیا۔ اور اس تبدیلی کے باب میں حسبِ معمول وحی[82] آسمانی کو پیش کیا۔

اس متذکرہ بالا تبدیلی کی بابت سورہ بقرہ میں بہت سی آیات نازل ہوئیں اور ان میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ کعبہ اور حضرت ابراہیم کا دین جن کو اسلام از سر نو زندہ کرنے کا دعویدار ہے یہودی دین اور یہودیوں کے قبلہ سے بہت بہتر ہے۔ نصاریٰ کی طرف بھی ان الفاظ میں کہ ہم نے لیا رنگ[83]

---

81 مفسر حسین نے لفظ مہیمنا کا ترجمہ نگہبان کیا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ مھیما علیہ نگاہبانست بر کتب کہ محافظت میکند از تغیر۔ دیکھو تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ نمبر ۱۴۸ اس آیت میں قرآن کی فضیلت تمام کتب آسمانی پر ثابت ہے اس لئے کہ اسے محافظ امین۔ شاہد امانتدار سب کتابوں کا قرار دیا پس قرآن جامع وشامل ہے اور ہدایت میں کامل۔ خلاصۃ التفاسیر جلد اوّل کا صفحہ نمبر ۵۲۹ ملاحظہ فرمایئے۔

82 پہلے جب حضرت محمد نے مکہ کی جگہ یروشلم کو قبلہ مقرر کیا تھا اس تبدیلی کا ذکر قرآن میں نہیں پایا جاتا پر اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ سورہ بقرہ میں دوسرے سیپارہ کی پہلی آیت میں اسی باب میں یوں لکھا ہے کہ **سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَن قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا** یعنی اب کہینگے بے وقوف لوگ گاہے پھر گئے مسلمان لوگ اپنے قبلہ سے جس پر تھے؟ اور اس پر مفسر جلال الدین فرماتے ہیں کہ جب حضرت محمد نے ہجرت کی تو اپنے تمام مومنین کو حکم دیا کہ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں پر یہ صرف چھ سات مہینوں کے لئے تھا بعد ازاں پھر کعبہ ہی قبلہ ہو گیا۔

83 سورہ بقرہ میں صرف **صبغۃ اللہ** یعنی خُدا کا رنگ لکھا ہوا ہے اور سیل صاحب نے لفظ ہم نے لیا زیادہ کیا ہے راڈویل صاحب لفظ اسلام کی ایزادی سے لکھتے ہیں کہ خُدا کا رنگ یا بپتسمہ اسلام ہے۔ پامر صاحب فرماتے ہیں کہ اسکے معنی خُدا کے رنگ کے ہیں اور کپڑا رنگنے سے ماخوذ ہے **صبغہ** کے معنی بپتسمہ کے نہیں ہیں۔ مفسرین اس کے ترجمہ میں متفق نہیں ہیں بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنی محض دین اللہ کے ہیں اور بعض

اللہ کا اشارہ کیا گیا ہے اور اس سے یہ مراد ہے کہ صرف اسلام قبول کرنے سے انسان کی حقیقی نئی پیدائش ہوتی ہے۔ چنانچہ قبلہ کی تبدیلی کے متعلق مفصل طور پر دوسرے سیپارہ کے پہلے رکوع میں یوں لکھا ہے۔ **وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلاَّ لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلاَّ عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللّهُ وَمَا كَانَ اللّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللّهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ قَدْ نَرَى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاء فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ فَوَلُّواْ وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ**۔ یعنی اور وہ قبلہ جو ہم نے ٹھہرایا جس پر تو تھا نہیں مگر اسی واسطے کہ معلوم کریں کہ کون تابع ہے رسول کا اور کون پھر جاویگا الٹے پاؤں؟

اور یہ بات بھاری ہوئی مگر ان پر جن کو راہ دی اللہ نے اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا یقین لانا۔ البتہ لوگوں پر شفقت رکھتا ہے مہربان۔ ہم دیکھتے ہیں پھر جانا تیرا منہ آسمان میں سے سو البتہ پھرینگے تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے۔ اب پھیر منہ اپنا مسجد الحرام کی طرف اور جس جگہ تم ہوا کرو۔ پھیرو منہ اسی کی طرف۔

حضرت محمد کی زندگی میں مذکورہ بالا تبدیلی کی نسبت احادیث میں بہت سے قصے مندرج ہیں چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ بھی ہے کہ جب آپ نے یہودیوں کو اس درجہ کا ضدی پایا تو جبرائیل فرشتہ سے کہا میں چاہتا ہوں کہ خُدا پھر کعبہ کو ہمارا قبلہ مقرر کردے۔ جبرائیل نے جواب دیا کہ خُدائے تعالیٰ کی درگاہ میں تو بہت معزز و ممتاز (اعلیٰ) ہے۔ سو بہتر یہ ہے کہ تو خود ہی خُدا سے اس امر کی درخواست کرے۔

اس کے بعد قبلہ کی تبدیلی کے لئے آپ ہمیشہ وحی آسمانی کے منتظر تھے۔ علاوہ ازیں پہلے جو یہودیوں کے ساتھ روزے رکھتے تھے۔ اب ان کے عوض ماہِ رمضان روزوں کا مہینہ قرار دیا گیا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے ۲۳ویں رکوع میں لکھا ہے "مہینہ رمضان کا جس میں نازل ہوا قرآن۔ ہدایت واسطے لوگوں کی اور کھلی نشانیاں راہ کی اور فیصلہ پھر جو کوئی پاوے تم میں یہ مہینہ تو وہ روزہ رکھے اور پھر اسی سورت کے انیسویں رکوع میں یہودیوں کو نہایت سختی سے یوں خطاب کیا گیا ہے "یعنی جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ اُتارا ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان بعد اس کے کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب[84] میں۔ ان کو لعنت دیتا ہے اللہ اور لعنت دیتے ہیں سب لعنت دینے والے۔

یہودیوں میں سے جنہوں نے اسلام کو قبول کیا تھا ان میں سے بعض ان مذکورہ بالا تغیر و تبدیل کے باعث یا چند دوسرے عام اسباب کی وجہ سے یہودی شریعت کی بعض باتوں کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ ان کو سورہ بقرہ کے پچیسویں رکوع میں یوں عتاب (غصہ) کرکے خبردار کیا گیا ہے۔ **يَا أَيُّهَا**

---

ختنہ کے معنی بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگرچہ مسیحیوں نے ختنہ کے عوض میں بپتسمہ کی رسم اختیار کی ہے تو بھی مسلمانوں میں ایک ایسی رسم ہے جو اپنے پورا کرنیوالے کو پاک کرتی ہے۔ اور جو اس خیال میں متفق ہیں اور وہ اس کا یوں بیان کرتے ہیں صبغۃ اللہ ختان است و آن تطہر مسلمان است یعنی صبغۃ اللہ ختنہ ہے اور وہ مسلمانوں کو پاک کرتا ہے تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ ۲۳۔

نیز اسی لفظ کے معنی محض رنگ کے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص دین عیسوی میں داخل ہوتا تھا اس کے جسم اور لباس کو زرد رنگ میں رنگتے تھے۔ پر بعض کا یہ خیال ہے کہ اس کے بال بچوں کو زرد رنگ گھول کر پانی میں بپتسمہ دیتے تھے۔ پھر یوں بھی بیان کرتے ہیں کہ جب کوئی شخص مسلمان ہوتا تھا تو استعارہ کے طور پر اس سے روحانی بپتسمہ مراد لیتے تھے کیونکہ وہ بُت پرستی کی نجاست و آلائش سے پاک و صاف کیا جاتا تھا۔ غرض ان تمام باتوں میں مفسرین اسلام اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ خواہ بلحاظ قبلہ دیکھیں یا بلحاظ بپتسمہ عیسائیوں کے درمیان مسلمانوں سے اچھی اور عمدہ رسوم نہیں ہیں۔ خلاصۃ التفاسیر جلد اوّل کا صفحہ نمبر ۸۰ ملاحظہ فرمائیے۔

[84] جس کتاب کا اس جگہ ذکر ہے اس سے توریت مراد ہے اور جو لوگ اس کے معانی کو چھپاتے ہیں ان پر خُدا کی طرف سے لعنت ہے اور دوسرے لعنت کرنے والوں سے فرشتے جن اور آدمی مراد ہیں۔ دیکھئے تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ ۲۶ اور تفسیر عبداللہ ابن عباس صفحہ ۲۹۔

**الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ[85] اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ** یعنی اے ایمان والو داخل ہو مسلمانی میں پورے۔[86] اور مت چلو قدموں پر شیطان کے۔ وہ تمہارا صریح (صاف) دشمن ہے۔ پھر اگر ڈگمگے لگو بعد اس کے کہ پہنچے تم کو صاف حکم تو جان رکھو کہ اللہ زبردست ہے حکمت والا۔ پوچھ بنی اسرائیل سے کتنی دیں ہم نے ان کو واضح آیتیں؟ اور جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچ چکے اس کو۔ تو اللہ کی مار سخت ہے۔

حضرت محمد اور یہودیوں کے درمیان یہ دشمنی ایک قدرتی بات تھی۔ اور بالکل امر طبعی کا حکم رکھتی تھی۔ فقط یہی بات نہ تھی کہ یہودی لوگ حضرت محمد کی تعلیم اور ان کے دعویٰ کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ بلکہ عملی طور پر خاص کر اصولی باتوں میں ان کی سخت مخالفت کی گئی تھی۔ جیسا کہ آگے چل کر بیان کیا جائے گا۔ آنحضرت بہت چاہتے تھے کہ اہل عرب کی پرانی رسومات قائم رہیں۔ یہاں تک کہ آپ نے بُت پرستوں اور منکروں کے بہت سے دستوروں کو اسلام میں قائم رکھا۔ وہ لوگ اپنی شریعت کے مطابق اپنی رسومات کے بڑے حامی تھے۔ اور ان کی اکثر رسومات ان کی شریعت پر مبنی تھیں۔ اب وہ وقت آگیا کہ حضرت محمد یہودیت سے بالکل دست بردار ہوں۔ اور بعض عربی مصنف بیان کرتے ہیں کہ اس وقت آپ نے بہت سے تغیر و تبدل (تبدیلیاں) کرنے شروع کئے۔ اور اس سے خاص غرض یہ تھی کہ یہودیت کی مشابہت[87] اسلام سے بالکل جاتی رہے۔ جب آپ نے یہودیوں کو اس طرح رد فرمایا تو اس وقت ساتھ ہی ساتھ آنحضرت نے اہلِ مکہ کو حج کعبہ کی اجازت دے کر ان کے ساتھ میل ملاپ اور رشتہ اتحاد قائم کرنیکی کوشش کی۔ چنانچہ سورہ بقر کے ۲۴ رکوع میں لکھا ہے۔ **وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ** یعنی پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ کے واسطے۔ پھر اسی طرح بُت پرستوں اور منکرین کی پرانی رسومات کے جاری رکھنے کی خُدا سے منظوری حاصل کی گئی۔ اور صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے گرد پھرنا برقرار رکھا گیا۔ چنانچہ

---

[85] **نعمتہ اللہ**۔ سے بعض کے نزدیک خود حضرت محمد مراد ہیں زیادہ صحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اس سے قرآن مراد ہے۔

[86] مفسرین کا بیان ہے کہ سچے دین یعنی سلم سے دین اسلام مراد ہے اور خطوات الشیطن یعنی شیطان کے قدموں سے شیطان کا فریب اور اس کی وہ دھوکہ وہی مراد ہے جس کے وسیلہ سے وہ یہودیوں کو منسوخ شدہ شریعت کی اطاعت کی طرف ترغیب و تحریص دلاتا ہے۔ جس کا بیان تفسیر حسینی جلد دوم کے ۳۵ ویں صفحہ پر یوں کیا گیا کہ وساوس شیطانی باحکام منسوخہ یعنی منسوخ شدہ شریعت کی بابت شیطان کے وسوسے ہیں۔

[87] ربی گائیگر **جملعه کراهته لمو فقته لنفی الشبیه بالیهود** کو اپنی کتاب مسمی Washat Muhamedans dum fuduntmme afgenoun کے صفحہ ۳۸ میں اقتباس کرتے ہیں اور یہ فاضل اس امر کو بیان کرتے ہیں کہ حضرت نے کس قدر تغیر و تبدل کئے۔ پھر وہ نماز عشا کا ذکر بھی کرتے ہیں جو کہ شام کے کھانے کے بعد تالمودی احکام کے برخلاف پڑھی جاتی تھی۔ مستورات کے متعلق جس قدر قوانین ہیں وہ سب کے سب یہودیوں کی نسبت اہل عرب کے دستورات سے زیادہ تر موافقت رکھتے ہیں۔

سورہ بقرہ کے ۲۳ رکوع میں جو یہ اجازت دی گئی ہے کہ احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم یعنی حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے وغیرہ بالکل تالمودی تعلیم کے برخلاف ہے اور پھر عورتوں کے متعلق اسی سورت میں آگے چل کر جو قوانین مقرر کئے ہیں وہ نہایت ہی نفرت انگیز ہیں یہاں تک کہ سید امیر علی صاحب کے نزدیک ایسی آیات بعد کی آیات سے منسوخ ہو گئی ہیں۔ (دیکھو لائف آف محمد صفحہ ۲۴۸) پر تاہم اسلام اس سے دستبردار نہیں ہوا بلکہ یہ قانون بدستور جاری ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ کس طرح حضرت محمد نے اسلام کو یہودیت سے الگ کرنے کی کوشش کی۔ سید امیر علی صاحب اپنی کتاب Personal Law of the Muhammadan's کے صفحہ ۳۳۵ پر اس قانون کا ذکر کرتے ہیں۔ اور بحیثیت مورخ قرآنی تحائف پر افسوس کرتے ہیں اور اس کی صحت کو شکوک مبہم قرار دیتے ہیں۔ پر ایک باہر شریعت دان کی حیثیت میں وہ اس کی ضرورت کے بھی اقراری ہیں۔ قانون کے اس امر کے متعلق فی الحقیقت مستعمل ہے وہ سیلی صاحب کی کتاب Inameea کے صفحہ ۱۴۰ اور Hanifow کے صفحہ ۲۹۲ میں پایا جاتا ہے۔ بہر کیف جو قوانین استثنا کی کتاب میں مندرج ہیں یہ ان کے برخلاف اور برعکس ہے۔ دیکھو استثنا کے ۲۴ باب کی پہلی چار آیتیں۔

سورہ بقرہ کے ۱۹ رکوع میں لکھا ہے "صفا اور مروہ جو ہیں نشان ہیں اللہ کے۔ پھر جو کوئی حج کرے اس گھر کا یا زیارت تو نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذکورہ بالا آیات بہت مدت بعد پہلے حج کے موقعہ پر نازل ہوئیں لیکن ان کو اس جگہ تحریفاً درج کر دیا گیا۔ سورہ بقرہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت محمد جب مدینہ میں وارد ہوئے تو شروع شروع میں بہت کچھ ہوشیاری وعیاری کام میں لائے۔

چنانچہ اس وقت کی تواریخ سے اس امر کی بخوبی تشریح ہو جاتی ہے۔ جس طرح آنحضرت پر اخلاقی اور ملکی معاملات کی ضروریات کے مطابق عین وقت پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔ آپ کے حسب حال اور حسب ضرورت آپ کے دعویٰ کی تائید ہوتی تھی یہ آیتیں نہایت عمدہ نظیر ہیں۔ علاوہ ازیں اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت محمد کو مدینہ جاتے ہی اس امر کا کامل یقین ہو گیا تھا۔ کہ اپنے ہم وطنوں یعنی اہلِ مکہ سے ضرور بہت جلد علانیہ حرب وصرب (لڑائی وجنگ) اور معرکہ آرائی کرنی پڑیگی۔ پس بہر حال حضرت محمد کو اس وقت ضروری تھا کہ ان آنے والی تکالیف ومصائب کو برداشت کرنے کے لئے مومنین کو تیار کریں اور ان کی ہمت بڑھائیں۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں یوں مندرج ہے۔ کہ **أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْاْ مِن قَبْلِكُم مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاء وَالضَّرَّاء** (آیت ۱۲۴) **أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُواْ مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّهُ مُوتُواْ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لاَ يَشْكُرُونَ** (آیت ۲۴۶) یعنی کیا تم کو خیال ہے کہ تم جنت میں چلے جاؤ گے۔ اور ابھی تم پر آئے نہیں احوال ان کے جو آگے ہو چکے تم سے۔ پہنچی ان کو سختی اور تکلیف۔ تو نے نہ دیکھے وہ لوگ جو نکلے اپنے اپنے گھروں سے (اور وہ ہزاروں تھے) موت کے ڈر سے پھر کہا ان کو اللہ نے مر جاؤ۔ پھر جلایا ان کو بیشک اللہ تو فضل رکھتا ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

اس ترغیب وتحریص (لالچ وحرص) دلانے اور ہمت بڑھانے کے بعد آنحضرت نے حضرت موسیٰ اور ساؤل کے محاربات (لڑنے والے) اور جنگ وجدل کا جن کا انہیں سامنا کرنا پڑا ذکر کرنا شروع کر دیا۔ اور آپ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ساؤل وجدعون میں فرق نہیں کر سکے جس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ آنحضرت توریت شریف کی تواریخ سے بالکل ناواقف تھے تاہم زمانہ قدیم کے بہادروں اور شمشیر زنوں کے قصص سے جو آنحضرت نے سنائے مومنین کی ہمت بڑھ گئی اور بہت جوشی میں آ گئے۔

مسلمانوں کے دلوں میں یہودیوں سے دشمنی اور عدوات قائم ہو گئی۔ اور جنگ بدر کے بعد یہ دشمنی بہت بڑھ گئی۔ فتح مندی کے جوش میں آ کر حضرت محمد نے ایک اسرائیلی فرقہ بنی قینقاع سے کہا کہ اسلام قبول کرو ورنہ تمہارا وہی حال ہو گا جو جنگ بدر میں قریش کا ہوا۔ لیکن یہ اسرائیلی فرقہ آپ پر ایمان نہ لایا اور آنحضرت نے ان لوگوں کو ملک سے خارج کر دیا اور ان کا تمام مال واسباب ضبط کر لیا۔

بنی ندہر بہت مالدار اور متمول (دولت مند) تھے۔ اور جب تک قبلہ کی تبدیلی نہ ہوئی ان کا ایک بڑا معلم حضرت محمد کا دوست تھا۔ لیکن قبلہ کی تبدیلی کے بعد وہ آپ کا مخالف ہو گیا۔ اور آنحضرت کی رضامندی سے خفیہ طور پر قتل کیا گیا۔ پھر اس فرقہ کے تمام لوگوں کو آپ نے یوں کہا۔ کہ پیغمبرِ خُدا کا فرمان یہ ہے کہ سات دن کے اندر اندر ملک سے نکل جاؤ۔ جو سات کے بعد یہاں پایا جائیگا اس کا سر قلم کیا جائیگا۔ ان لوگوں نے انکار کیا اور کہا کہ ہم نہیں جائینگے۔ پر چونکہ مسلمانوں کی جماعت ان کے مقابلہ میں بہت زبردست تھی اسی لئے بیچارے یہودی تابِ مقاومت نہ لا سکے (مقابلے کی طاقت نہ رکھ سکے)۔ اور ملک سے خارج کئے گئے اور ان کے زرخیز کھیت اور تمام مال واسباب مہاجرین میں تقسیم کیا گیا۔ اور سورۃ الحشر میں آپ کے اس ناشائستہ

فعل کے لئے الہٰی منظوری یوں درج ہے۔ کہ **هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ مَا ظَنَنتُمْ أَن يَخْرُجُوا وَظَنُّوا أَنَّهُم مَّانِعَتُهُمْ حُصُونُهُم مِّنَ اللَّهِ فَأَتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيْدِيهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِينَ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ وَلَوْلَا أَن كَتَبَ اللَّهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَاءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ شَاقُّوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَمَن يُشَاقِّ اللَّهَ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ مَا قَطَعْتُم مِّن لِّينَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوهَا قَائِمَةً عَلَىٰ أُصُولِهَا فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيُخْزِيَ الْفَاسِقِينَ** یعنی وہی ہے جس نے نکال دئے جو منکر ہیں کتاب والوں سے اور اگر نہ ہوتا کہ لکھا تھا اللہ نے ان پر اُجڑنا تو ان کو مار دیتا دنیا میں اور آخرت میں ہے ان کو عذابِ آتش جو کاٹ ڈالا تم نے کھجور کا پیڑ یا رہنے دیا کھڑا اپنے جڑ پر سو اللہ کے حکم سے تا رسوا کرے بے حکموں کو (آیت ۲تا۵)۔

کھجور کے درختوں کو برباد کرنا اور کاٹنا عربی آئین جنگ اور موسوی شریعت[88] دونوں کی رو سے ممنوعہ اور ناجائز تھا۔ لیکن یہ ناواجب کام کر کے آنحضرت نے وحی کے وسیلہ سے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کیا۔ چنانچہ وحی کی خاص ہدایت کے مطابق لوٹ کے مال واسباب کا بہت سا حصّہ مہاجرین کو دیا۔ سورہ حشر کی ۸ آیت میں مسطور ہے کہ **لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ**[89] **الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ** ترجمہ۔ واسطے ان مفلسوں وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے آئے ہیں اپنے گھروں سے اور مالوں سے۔ ڈھونڈتے آئے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی اور مدد کرنے اللہ کی اور اس کے رسول کی وہی لوگ سچے ہیں۔

پھر سورہ نساء کے ۸ رکوع میں یہودیوں کو سخت لعنت وملامت کر کے متنبہ کیا۔ اور نہایت درشت گوئی (سخت بیانی) اور تلخ بیانی سے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ **إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ** یعنی جو لوگ منکر ہوئے ہماری آیتوں سے ان کو ہم ڈالینگے آگ میں۔ جس وقت پک جاویگی کھال ان کی بدل کر دینگے ان کو اور کھال تا کہ چکھتے رہیں عذاب۔

۵ ہجری میں بنی قرئضہ یہودیوں کی ایک بڑی زبردست جماعت کا استیصال (جڑ سے اُکھاڑنا) ہوا۔ یہ لوگ بہت چاہتے تھے کہ آنحضرت کے مخالفوں سے مل جائیں اور اس میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں ہے۔ کہ تمام دیگر یہودیوں کی طرح بنی قرئضہ کے لوگ آنحضرت سے نہایت خفا اور سخت ناراض تھے۔ ممکن ہے کہ ان کی موجودگی آنحضرت کے نزدیک خطرہ کا باعث ہو۔ لیکن ان پر جس قدر ظلم وستم کیا گیا اس کے بارہ میں آنحضرت کوئی معقول عذر (مناسب بہانہ) پیش نہیں کر سکتے اور کسی صورت میں آپ کو بریت (آزادی) حاصل نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے عرض کی کہ ہمیں قتل نہ کیجئے ہم ملک چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان بیچارے مظلوموں کی یہ سب منت وزاری بے فائدہ تھی۔ بنی قرئضہ کے تمام آدمی پانچ پانچ چھ چھ کر کے آنحضرت کی عین حضوری میں نہایت بیدردی اور بے رحمی سے قتل کئے گئے۔ بازار میں آٹھ سو آدمیوں کا خون موجزن تھا۔ اور آنحضرت کی بے رحمی اور خونریزی سے زمین لال تھی۔ آپ کے حکم کے مطابق خندقیں کھودی گئیں مظلوم قیدیوں کو زبردستی ان کے کنارے پر دوزانو کھڑا کر کے سر قلم

---

88 دیکھو توریت شریف کتاب استثنا ۲۰:۱۹

89 مہاجرین کو آئندہ جہان یعنی عالم آخرت میں بھی بڑے بدلے کی امید دلائی گئی ہے چنانچہ سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں یوں مرقوم ہے **هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ** پھر جو لوگ اپنے وطن سے چھوٹے اور نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور لڑے اور مارے گئے میں اتاروں گا ان سے برائیاں ان کی اور داخل کروں گا باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں ندیاں بدلا اللہ کے یہاں سے اور اللہ ہی کے یہاں ہی اچھا بدلا۔

کر دیا جاتا تھا۔ اور لاش کو خندق میں پھینک کر اوپر خاک ڈال دیتے تھے۔ عورتوں کی ایک بڑی تعداد تو مسلمانوں نے آپس میں تقسیم کر لی اور جو باقی رہیں ان کو غلامی میں فروخت کر دیا۔ آنحضرت کے پانچویں حصّہ میں قریباً دو سو عورتیں اور بچے آئے اور آپ نے انہیں گھوڑوں اور اسلحہ جنگ کے عوض میں بدوی لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ایک مقتول کی نہایت خوبصورت اور حسین بیوہ آنحضرت نے اپنے حرم سرائے میں داخل کر لی۔

جب اس طرح دو قومیں جلاوطن ہو گئیں۔ اور ایک کا وہیں قلع قمع (توڑ پھوڑ) کیا گیا تو مدینہ میں یہودی لوگ ہمیشہ کے لئے کمزور ہو گئے اور حضرت محمد آئندہ فتوحات کے لئے میدان جنگ میں خوب ہاتھ پاؤں لمبے[90] کرنے لگے۔

سورہ احزاب کی ۹ آیت سے لے کر ۲۷ آیت تک یہودیوں پر متذکرہ بالا حملہ کا بیان ہے چنانچہ اس بیان کے آخر میں ۲۶ اور ۲۷ آیت میں یوں مندرج ہے۔ **وَأَنزَلَ الَّذِينَ ظَاهَرُوهُم مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِن صَيَاصِيهِمْ وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيقًا تَقْتُلُونَ وَتَأْسِرُونَ فَرِيقًا وَأَوْرَثَكُمْ أَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ**۔ یعنی اور اتار دیا ان کو جو ان کے رفیق (ساتھی) ہوئے تھے کتاب والے ان کی گڑھیوں سے اور ڈالی ان کے دلوں میں دہاک کتوں کو تم جان سے مارنے لگے اور کتّوں کو بندے کیا اور وارث کیا تم کو ان کی زمین اور ان کے گھر اور ان کے مال کا۔

اس ماہ جبیں یہودی عورت ریحانہ نے جس کو حضرت محمد نے اپنے لئے مخصوص کر لیا تھا آپ کے ساتھ نکاح کرنے سے انکار کیا اور کہا کہ حضرت مجھ کو صرف لونڈی اور خادمہ کے طور پر رکھئے اس میں فریقین کے لئے آسانی ہو گی۔ نیز اس عورت نے اپنے قدیمی دین سے دست بردار ہونے اور اسلام قبول کرنے سے انکار کیا اور یہ بات بالکل معقول (مناسب) معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ آنحضرت نے کس طرح پاس کھڑے ہو کر اس کے مظلوم شوہر اور رشتہ داروں کو قتل کرایا۔ پھر کس طرح ممکن تھا۔ کہ وہ ایسے ظالم شخص کو اپنا شوہر قبول کرنے کے لئے خوش ہوتی۔ وہ بیچاری لونڈی بننے سے کسی طرح انکار نہ کر سکتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت نے اس کو ایک غیر منکوحہ بیوی کے طور پر رکھا۔ اور اپنے اس فعل کو اذن الہیٰ کا ملمع (خُدا کی طرف سے اجازت کا پردہ) چڑھانے کے لئے وحی آسمانی کا پیغام پڑھ سنایا کہ "اے نبی ہم نے حلال رکھیں تجھ کو تیری عورتیں جن کہ مہر تو دے چکا اور جو مال ہو تیرے[91] ہاتھ کا جو ہاتھ لگاوے تجھ کو اللہ۔

اب ہم ذرا آنحضرت کے ابتدائی ایام کی نسبت سوچیں اور دیکھیں کہ آپ نے معاملاتِ جنگ اور فوج کشی کے متعلق کس قدر کوششیں اور جانفشانیاں کیں۔ جنگ بدر اگرچہ آنحضرت کی محاربانہ (لڑائی، جنگ) زندگی کی پہلی لڑائی نہ تھی۔ تو بھی اس میں کلام نہیں کہ آپ کو اب تک جس قدر لڑائیاں پیش آئی تھیں ان میں سے جنگ بدر سب سے زیادہ مشہور ہے۔ بدر کی لڑائی سے پیشتر چار قزاقانہ حملوں میں آنحضرت خود علم بردار تھے۔ اور تین مرتبہ آپ[92] کے نائبوں کے زیر فرمان مسلمانوں نے لوگوں کو لوٹنے کے لئے چڑھائی کی۔ لیکن پورے طور سے فائز المرام (کامیاب) نہ ہوئے۔ کیونکہ اسے نہ تو قریش کا کچھ چنداں نقصان ہوا۔ اور نہ مسلمانوں کو حسب مراد لوٹ مار نصیب ہوئی۔ اپنی برادری کے لوگوں پر آپ نے صرف ایک مرتبہ ماہ رجب العرب میں کسی قدر کامیابی حاصل کی۔ ماہ رجب العرب اہلِ عرب کا ماہ حرام ہے۔ اور اس کو اس وقت سے مانتے چلے آتے ہیں۔ جب

---

[90] اس کے مفصل بیان کے لئے Muir's Life of Muhammad تیسری جلد کا ۲۷۶ صفحہ ملاحظہ فرمایئے۔

[91] سید امیر علی صاحب فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک ریحانہ کا حضرت محمد کی غیر منکوحہ بیوی ہونا ایک جعل اور بناوٹ کا حکم تھا۔ Life of Muhammad صفحہ ۱۴۔ اس ناواجب امر سے بریت کے لئے سید امیر علی جیسے نیکو روش مصنف کا کوشش کرنا ثابت کرتا ہے کہ واقعی یہ ایک نازک معاملہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ واقعہ حقیقی ہے اور مفسر حسین جو کہ بڑا ہوشیار اور است بیان مصنف ہے کہتا ہے کہ یہ آیت فی الحقیقت صفیہ ریحانہ اور ان کی مانند دیگر لونڈیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے چنانچہ تفسیر حسینی کی دوسری جلد کے ۲۰۴ صفحہ میں مندرج ہے کہ صفیہ ریحانہ وامثال ایشاں۔

[92] جب حضرت محمد نے مدینہ میں سکونت اختیار کی تو عرصہ دس سال میں آپ نے اسلامی ترقی کے لئے ۳۸ لڑائیاں کیں جن میں سے ۲۷ میں آپ نے خود میدان جنگ میں سپہ سالاری کی۔ کیلی صاحب کی کتاب Muhammad and Muhammadanism کے ۳۲۴ ویں صفحہ پر ابن اسحاق اور ابن ہشام کے مقتبسات ملاحظہ کیجئے۔

کہ قومی عداوت وحسد کے باعث صلح وامن کا نام ونشان تک نہ تھا۔اس مذکورہ بالا حملوں میں مسلمانوں نے قریش کے ایک قافلہ کو لوٹا اور چونکہ ان کا یہ فعل عرب کے دستورات کے برخلاف تھا۔اس لئے مسلمانوں کو مال غنیمت سے اس قدر تسلی وخوشی حاصل نہ ہوئی. جس قدر کہ اس مجرمانہ فعل سے ان کے دلوں پر خوف وہراس چھا گیا۔پہلے تو حضرت محمد نے صاف انکار کیا اور کہا کہ ماہ حرام میں ڈاکہ مارنے کا میں نے ہر گز حکم نہیں دیا پر جب دیکھا۔کہ اس سے لوگوں کو تسلی نہیں ہوئی تو پھر آپ نے وحی آسمانی کا فرمان پڑھ سنایا جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان ڈاکوؤں کو خُدا نے انکا جرم معاف کر دیا ہے۔چنانچہ سورہ بقرہ کے ۲۷ رکوع کی آیت ۲۱۷ میں یوں مرقوم ہے۔**يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ.** یعنی تجھ سے پوچھتے ہیں حرام کے مہینے کو اس میں لڑائی کرنی۔تو کہہ لڑائی اس میں بڑا گناہ ہے۔اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ ماننا اور مسجد حرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے اس سے زیادہ گناہ ہے اللہ کے ہاں اور دین سے بچانا مار ڈالنے سے زیادہ بُرا ہے۔

ابنِ اسحاق اس آیت کا مطلب یوں بیان کرتا ہے کہ آنحضرت نے اس آیت سے مومنین کو اس طرح تسلی دی کہ اگر تم نے ماہ حرام میں لڑائی کی اور کشت وخون (قتل وغارت) کیا تو کونسی بڑی بات ہے وہ تو تم کو خُدا کی راہ سے روکتے ہیں اور خُدا کے نزدیک تمہاری خونریزی سے یہ گناہ بہت بڑا ہے۔قبیلہ قریش کے لوگ نہایت قہر آلودہ تھے اور کہتے تھے کہ محمد اور اس کے مقلدوں (مریدوں) نے خونریزی اور لوٹ مار سے اور لوگوں کو قید کرنے سے ماہ حرام کو ناپاک کر دیا ہے۔

ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں سے بڑی بڑی مہمات (لڑائیاں، جنگوں) اور معرکہ آرائیوں کی بنیاد پڑ گئی۔اس عرصہ میں وحی قرآنی جس قدر پیغام لایا ان میں انتقام اور لشکر کشی کے مضامین کی روح کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھی۔اور ان میں محاربہ (جنگ) ومقابلہ کے باب میں بڑی ترقی نظر آتی ہے۔سورہ رعد ایک آخری مکی سورۃ ہے۔لیکن اس کی ۴۱ ویں آیت آنحضرت کے مدنی ایام سے تعلق رکھتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔کہ اس آیت کے بعد میں یا تو حضرت محمد نے خود کو یا کسی جامع قرآن نے سورہ رعد میں داخل کر دیا ہے۔اس آیت میں مسلمانوں کے بُت پرستوں عربوں کے ممالک مقبوضہ کو دبا لینے اور ان میں بیجا مداخلت کرنے کا صاف بیان پایا جاتا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ **اوَلَمْ يَرَوْاْ أَنَّا نَأْتِي الأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللهُ يَحْكُمُ لاَ مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ۔** یعنی کیا نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں۔زمین پر گھٹاتے اس کو کناروں سے اور اللہ حکم کرتا ہے۔کوئی نہیں کہ پیچھے ڈالے اس کا حکم۔

پھر سورہ حج اغلباً مکی ہے۔لیکن بعض آیات آنحضرت کے ایام مکہ کے بعد کی اور صاف مدنی معلوم ہوتی ہے۔مثلاً چھٹے رکوع کی آیت ۳۹ میں یوں مندرج ہے۔**أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ** یعنی حکم ہوا ان کو جن سے لوگ ڈرتے ہیں اس واسطے کہ ان پر ظلم ہو۔اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔وہ جن کا نکالا ان کے گھروں سے اور کچھ دعویٰ نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا رب اللہ ہے۔

۲ ہجری میں حضرت محمد نے معلوم کیا کہ اپنے ہم وطنوں سے ضرور لڑائی پیش آئیگی۔چنانچہ سورہ بقرہ جو شروع شروع کی مدنی سورۃ ہے۔اس کے ۲۶ رکوع کی ۲۱۶ آیت میں اس طرح مرقوم ہے۔**كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تَكْرَهُواْ شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔** یعنی حکم ہوا تم پر لڑائی کا اور وہ بُری لگی ہے تم کو اور شاید تم کو بُری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے لئے۔

سورہ بقرہ میں اسی طرح کی اور بھی کئی آیات ہیں لیکن کسی قدر بعد کے زمانہ کی ہیں۔ اور گمان غالب ہے کہ ۷ ہجری میں پہلے حج کے موقعہ پر نازل ہوئی تھیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ضرور یہ آیات ساکنان مکہ کے حق میں ہیں۔ اور اگر وہ لوگ عہد حدیبیہ قائم نہ رہیں تو ان کے حق میں ۲۴ رکوع کی آیت ۱۹۱، ۱۹۲ میں یوں مندرج ہے۔ **وَقَاتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ إِنَّ اللّهَ لاَ يُحِبِّ الْمُعْتَدِينَ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُم مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ** اور لڑو بیچ راہ اللہ کے ان سے جو لڑتے ہیں تم سے اور زیادتی مت کرو۔ اللہ نہیں چاہتا زیادتی والوں کو۔ اور مارو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچلانا مارنے سے زیادہ ہے۔ اسی رکوع کی آیت ۱۹۳ میں پھر مذکور ہے۔ **وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ**[93] **وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّهِ فَإِنِ انتَهَواْ فَلاَ عُدْوَانَ إِلاَّ عَلَى الظَّالِمِينَ**۔ یعنی لڑو ان سے جب تک نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے اللہ کا۔ پھر اگر وہ باز آویں تو زیادتی نہیں مگر بے انصافوں پر۔

بنی اسرائیل کے جنگ وجدل کا بیان کرکے اور خصوصاً ساؤل کی معرکہ آرائیوں کے حوالے دے کر آنحضرت نے اپنے مریدوں کی ہمت بڑھائی۔ اور ان کے دلوں میں آتش حرب (لڑائی کی آگ) کو مشتعل کیا۔ حضرت محمد کا ساؤل اور جدعون میں تمیز کرنا اور ان کا خلط ملط حال بیان کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے۔ کہ آنحضرت کو عہدِ عتیق کی تواریخ کا صحیح علم نہ تھا۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے ۲۲ اور ۲۳ رکوع میں بنی اسرائیل کو یوں کہتے ہوئے پیش کیا گیا ہے کہ "یعنی بولے ہم کو کیا ہوا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم کو نکال دیا ہے ہمارے گھر سے اور بیٹوں سے۔ بہت جگہ جماعت تھوڑی غالب ہوئی ہے جماعت بہت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ ساتھ ہے ٹھہرنے والوں کے۔

پس جس طرح جدعون کی تھوڑی سی فوج مدیانیوں کے لشکر پر غالب آئی۔ عین اسی طرح سے مسلمانوں کی چھوٹی سے گروہ نے اہلِ مکہ پر غلبہ حاصل کیا۔ اس قسم کی فتوحات آنحضرت کی تعلیم کی صحت و سچائی پر دال (نشان) تھیں۔ اور خُدا تعالیٰ کی طرف سے نشان و شاہد کے طور پر پیش کی جاتی تھیں۔ غرض ان تدابیر اور اس طرح کی تعلیم کے وسیلہ سے حضرت محمد نے مومنین کے دلوں کو مضبوط کیا۔ اور اپنے آپ کے جھنڈے تلے لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔

اس میں کلام نہیں کہ قریش نے مسلمانوں کو مکہ سے خارج کر دیا تھا۔ اور اس وجہ سے یہ خیال ہو سکتا ہے۔ کہ تمام جنگ وجدل کی بنیاد اسی بات پر تھی اور مسلمانوں کا چنداں قصور نہ تھا۔ لیکن اب تو جہاد کا حکم اس حد سے تجاوز (حد سے بڑھنا) کر گیا۔ اور یوں ارشاد ہوا کہ جب تک اکیلے واحد خُدا کی پرستش شروع نہ ہو۔ یعنی جب تک اہل مکہ اسلام قبول نہ کریں تب تک تلوار میان میں نہ ہو اور محاربہ و مقاتلہ (لڑائی و قتل) جاری رہے۔ دینِ حق کی اشاعت بزور شمشیر (تلوار کے زور پر) ہونے لگی۔ اور سوائے اسلام کے کسی دوسرے دین کے جواز (اجازت) کا مطلق امکان نہ رہا پر مسلمانوں کی جماعت اب تک بزدل تھی اور شجاعت و مردانگی نے تاحال ان کے دلوں میں جڑ نہ پکڑی تھی۔ منافق یعنی وہ لوگ جو سچے دل سے مسلمان نہ تھے۔ تدابیر جنگ کے باب میں مخالفت کرنے لگے۔ پھر کچھ عرصہ بعد سورہ محمد نازل ہوئی۔ اور اس کے وسیلہ سے آنحضرت نے سچے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھا کر لڑائی پر آمادہ کیا۔ اور بزدلوں اور منافقوں (ریاکاروں) کو عذاب دوزخ سے ڈرایا اور زجر و معاقبت (لعنت و عذاب) کی۔ چنانچہ چوتھی اور پانچویں آیات میں

---

[93] راڈویل صاحب فتنہ کے معنی مکہ سے مسلمانوں کو خارج کرنے یا بُت پرستی کی ترغیب دینے کے کرتے ہیں اور سیل صاحب کہتے ہیں کہ اس سے بُت پرستی کی ترغیب مراد ہے اور سیل صاحب کا بیان مفسر حسین کے بیان سے مطابقت رکھتا ہے حتیٰ لا تکون فتنہ کا مطلب حسین کے نزدیک یہ ہے کہ تاآن غایت کہ فتنہ نباشد یعنی از شرک اثر نہ ماند۔ دیگر مفسرین اس کا بہت لمبا چوڑا مطلب بیان کرتے ہیں اور بہت کشادہ معنی مراد لیتے ہیں چنانچہ خلاصۃ التفاسیر جلد اوّل کے ۱۳۶ صفحہ میں یوں مندرج ہے کہ جب تک مسلمان نہ ہوں یا جزیہ نہ دیں تلوار میان نہ کرو۔ الجهاد ماضی الی یوم القیمه۔

مندرج ہے۔ کہ **فَإِذا**[94] **لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا**۔ یعنی سو جب تم بھڑو منکروں سے تو مارنی ہیں گردنیں یہاں تک کہ جب کٹاؤ ڈال چکے ان میں تو مضبوط باندھو قید۔ پھر یا احسان کر یو پیچھے اور یا چھوڑوائی لیجیو جب تک کہ رکھ دے لڑائی اپنے بوجھ۔ پھر سورہ انفال کے رکوع ۵ کی آیت ۳۹ میں مرقوم ہے کہ۔ **وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ**۔ یعنی لڑتے رہو ان سے جب تک نہ رہے فساد اور ہو جاوے حکم سب اللہ کا[95]۔ پھر سورہ محمد کی ۲۲ اور ۳۷ آیات میں پست ہمت اور بزدل مسلمانوں کی طرف یوں خطاب ہے۔ کہ **وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُورَةٌ فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ، فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ**۔ یعنی کہتے ہیں کہ ایمان والے کیوں نہ اتری ایک سورۃ؟ پھر جب اتری ایک سورۃ جانچی ہوئی اور ذکر ہوا اس میں لڑائی کا تو تُو دیکھتا ہے جن کے دل میں روگ ہے تکتے ہیں تیری طرف جیسے تکتا ہے کوئی بے ہوش پڑا موت کے وقت۔ سو تم بودے (کمزور) نہ ہوئے جاؤ اور پکارنے لگو صلح اور تم ہی رہو گے اوپر اور اللہ تمہارے ساتھ ہے۔

اسی طرح آنحضرت کی ان تدابیر و تجاویز سے اسلامی جہاد کی بنیاد پڑ گئی۔ اور یہ پہلا موقعہ تھا کہ اہلِ مدینہ کھلم کھلا لڑائی میں شامل ہوئے۔ حضرت محمد کے ساتھ اہل مدینہ نے صرف یہ وعدہ کیا تھا۔ کہ ہم آپ کی حفاظت کرینگے اور آپ کو پناہ دینگے لیکن اب ان کو اس سے بڑھ کر کھلم کھلا حملوں میں آپ کی مدد کرنا اور آپ کے دشمنوں سے لڑنا پڑا۔ تھوڑی دیر بعد ۶۲۴ ہجری میں بدر[96] کی لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی کے شرح بیان کی کچھ ضرورت نہیں۔

لڑائی سے پہلی رات کو کسی قدر بارش ہوئی۔ اور حضرت محمد نے خواب میں دیکھا کہ دشمنوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چنانچہ سورہ انفال کے دوسرے اور پانچویں رکوع میں ان دونوں باتوں کا ذکر یوں مندرج ہے۔ **إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ**۔ یعنی جس وقت ڈالدی تم پر اونگھ اپنی طرف سے تسکین کو اور اُتارا تم پر آسمان سے پانی کہ اس سے تم کو پاک کرے اور دور کرے تم سے شیطان کی نجاست (گندگی) جب اللہ نے ان کو دکھایا تیرے خواب میں تھوڑے اور اگر وہ تجھ کو بہت دکھاتا تو تم لوگ نامردی کرتے اور جھگڑا ڈالتے کام میں لیکن اللہ نے بچالیا۔

---

[94] نولدیکی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ سورۃ جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی اور بہت سے مفسرین کا بیان بھی اسی سورۃ میں صحیح ٹھہرتا ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جہاد کا یہ حکم سیدنا عیسیٰ مسیح کی دوسر آمد اور امام مہدی کے ظاہر ہونے تک جاری رہیگا۔ چنانچہ احادیث میں مرقوم ہے کہ الجہاد ماضی الی یومہ القیامۃ یعنی جہاد قیامت تک موقوف نہیں ہوگا۔ بعض کے نزدیک یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ حکم جنگ بدر سے پہلے آیا تھا اور ایک محدود مدت تک اسکا اجرا مراد تھا لیکن یہ حنفی فرقہ کا اعتقاد ہے شیعہ لوگ پہلے خیال کے متعقد ہیں۔ دیکھئے تفسیر حسینی جلد دوم صفحہ ۳۶۲ اور خلاصۃ التفاسیر جلد چہارم ۲۱۳۔ عبد بن عباس فرماتے ہیں کہ حتیٰ تضع الحراب اوزارھا کے معنی یہ ہیں کہ حتیٰ تیرک الکفارہ اشرکہا یعنی اس وقت تک کہ کافر اپنے شرک سے باز نہ آجاویں لیکن جب وہ چوتھی آیت سے جنگ بدر کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو یہ بات کچھ مشکوک سی رہتی ہے کہ اس 5 آیت سے وہ جہاد کا عام حکم مراد لیتے ہیں یا نہیں۔

[95] **قاتلو همه حتیٰ لا تلون فتنه** کے معنی مفسیر حسین کے نزدیک یہ ہیں کہ جب تک یہود و نصاریٰ اور دیگر مشرکین کا شرک موقوف نہ ہو قتل کرو چنانچہ تفسیر حسینی کی جلد اوّل کے ۲۳۹ صفحہ میں مندرج ہے کہ مشرک بناشد از وثنی و اہل کتاب۔ اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ منکرین اسلام کے ساتھ لڑنے کا بڑا تاکیدی حکم ہوا اور جب تک ویکون الدین کلہ اللہ کے مطابق سب حکم اللہ کا نہ ہو جاوے ہر طرح کی زبردستی اور کشت و خون جائز ہے۔

[96] اس لڑائی کے مفصل بیان کے لئے Muir's Life of Muhammad صفحہ نمبر ۱۲۸ جلد سوم کا بارھواں باب اور Muhammad and Mohammedanism مصنفہ کیلی صاحب کو ۱۴۶ سے ۱۵۰ صفحہ تک ملاحظہ کیجئے۔

جنگ بدر میں قریش نے شکست فاش کھائی۔ اوران میں سے بہتوں کو مسلمانوں نے قید کر کے بے رحیمی سے قتل کر ڈالا۔ لوٹ کا مال بہت تھا اور اس کی تقسیم کے باب میں جھگڑا ہو پڑا۔ ایک نہایت نفیس سرخ پیراہن گم ہو گیا اور منافقوں میں سے کسی نے کہا کہ وہ حضرت محمد نے لے لیا ہے۔ لیکن اس الزام سے آنحضرت کی بریت (رہائی) کے لئے یہ آیت نازل ہوئی کہ [97] **وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ** یعنی نبی کا کام نہیں کہ کچھ چھپائے رکھے۔ (سورہ آل عمران آیت ۱۶۱)۔ مالِ غنیمت کی تقسیم کے باب میں جو تنازعہ ظہور میں آیا تھا۔ اسکے اختتام اور انفصال (جُدا ہونا) کے لئے سورہ انفال کی پہلی آیت میں وحی کی معرفت خُدا کی مرضی کا اظہار اور اسکے آسمانی فیصلہ کا بیان یوں ہوا ہے۔ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الأَنفَالِ قُلِ الأَنفَالُ لِلّهِ وَالرَّسُولِ فَاتَّقُواْ اللّهَ وَأَصْلِحُواْ ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ**۔ یعنی تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا۔ تو کہہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا۔ سو ڈرو اللہ سے اور صلح کرو آپس میں اور حکم میں چلو اللہ کے اور اسکے رسول کے اگر ایمان رکھتے ہو۔

جب آنحضرت مذکورہ بالا آیت کے وسیلہ سے مال غنیمت پر اپنا کُلی استحقاق (پورا حق طلب کرنا) اور پورا حق جما چکے تو پھر اپنے اس دعویٰ کو ذرا اہلکار کر کے اسی سورۃ کے پانچویں رکوع کی آیت ۴۱ میں یوں پیش کیا۔ **وَاعْلَمُواْ أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِن كُنتُمْ آمَنتُمْ بِاللّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ** یعنی جان رکھو کہ جو غنیمت لاؤ کچھ چیز سو اللہ کے واسطے اس میں سے پانچواں حصّہ اور رسول کے اور قرابت والے کے اور یتیم کے اور محتاج کے اور مسافر کے اگر تم یقین لائے ہو اور اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اُتاری اپنے بندے پر جس دن فیصلہ ہوا[98]۔ جس دن بھڑیں دو فوجیں۔ چنانچہ مال غنیمت کی نسبت آج تک اسلامی شریعت یہی چلی آتی ہے۔

حضرت محمد کو مدینہ میں عزت و وقار حاصل کرنے کے لئے جنگِ بدر میں فتح مند اور ظفریاب (جیت۔ کامیاب) ہونا نہایت ضروری تھا۔ کیونکہ گذشتہ مار دھاڑ میں آپ کو بہت کم کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ اور اس سبب سے آپ کا جتھا بہت ضعیف (کمزور) سمجھا جاتا تھا۔ اب جنگ بدر میں فتحیاب ہو کر ہر طرح سے آپ نے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی اس جنگ میں معجزانہ طور پر خُدا نے آپ کی مدد کر کے آپ کو فتح مند اور ظفریاب کیا ہے۔ چنانچہ سورہ انفال کے پہلے رکوع کی آخری آیات میں یوں مرقوم ہے کہ [99] **إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلآئِكَةِ مُرْدِفِينَ وَمَا جَعَلَهُ اللّهُ إِلاَّ بُشْرَى وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ وَمَا النَّصْرُ إِلاَّ مِنْ عِندِ اللّهِ**۔ یعنی جب تم لگے فریاد کرنے اپنے رب سے تو پہنچا تمہاری پکار کو کہ میں مدد بھیجونگا تمہاری ہزار فرشتے لگاتار آنے والے۔ اور یہ تو دی اللہ نے فقط خوشخبری اور تا چین پکڑیں دل تمہارے اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے۔

---

[97] قاری نافی ابن امیر حمزہ الکسائی وماکان لنبی ان یغل کے بیان میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ان یغل نہیں ہے ان یغلَ یعنی مجہول کا صیغہ ہے اور اس صورت میں اس کے معنی یہ ہونگے کہ یہ بات اچھی نہیں کہ نبی کچھ چھپاتا پایا جاوے۔ دیکھو تفسیر بیضاوی۔

[98] تمام مفسرین کے نزدیک اس فیصلہ یا فتح سے فتح بدر مراد ہے۔ جو یوم الفرقان کہلاتا ہے۔ یوم الفرقان کا ترجمہ روز فعل۔ روز فتح اور ہلاکت کا دن مقرر کیا گیا ہے یعنی روز بدر جس میں نیک و بد اور خیر و شر میں فرق ہو گیا چنانچہ تفسیر حسینی جلد اوّل کے ۲۴۰ صفحہ میں مندرج ہے کہ روز بدر کے جداشدن حق از باطل در بود ربی گیگر اس امر کا بیان کرتے ہیں کہ لفظ فرقان ربیوں کے عبرانی لفظ سے لے لیا ہے اور اسکے معنی خلاصی یا کفارہ کے ہیں سورہ بقرہ کے ۲۲ رکوع میں اس لفظ کا مفہوم ماہ رمضان ہے جو گناہوں سے خلاصی بخشنے والا مہینہ خیال کیا جاتا ہے نہ کہ قرآن جو عموماً روشن کنند اور حق و باطل میں فرق کرنے والا خیال کیا جاتا ہے مفسرین لفظ فرقان کی یوں تشریح کرتا ہے کہ الفرقان واز حدود احکام وسائر شرائع دین کہ جدا کنندا ست میان حق و باطل دیکھو تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ ۳۰ Geiger's Judaism and Islam صفحہ ۴۱ اور Rodwell Quran صفحہ ۷۶۔

[99] تحقیق معلوم نہیں ہے کہ آیا یہ آیات قبیلہ قریش کے حق میں نازل ہوئی ہیں یا یہودیوں یا مومنین مدینہ کے حق میں (دیکھو بیضاوی کی تفسیر قرآن) عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس سے ساکنان مکہ یا اہالیان مدینہ مراد ہے۔ یہ نشان حضرت محمد کی نبوت کا ایک صریح ثبوت متصور ہوتا ہے۔ چنانچہ تفسیر حسینی کے صفحہ نمبر ۱۷ میں مندرج ہے کہ نشانے درست بر نبوت محمد۔

پھر آگے چل کر یہی مذکورہ مدد آنحضرت کے دعویٰ کی تائید (مدد) اور مومنین کی تنبیہ (نصیحت) اور دل ہی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے دوسرے رکوع کی ۱۳ آیت میں یوں مذکور ہے کہ [100] **قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَأُخْرَى كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَن يَشَاء إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لَّأُوْلِي الأَبْصَارِ** یعنی ابھی ہو چکا ہے تم کو ایک نمونہ دو فوجوں میں جو بھڑی تھیں۔ ایک فوج ہے کہ لڑتی ہے اللہ کی راہ میں اور دوسری منکر ہے۔ یہ ان کو دیکھتے ہیں اپنی دو برابر صریح آنکھوں سے اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جس کو چاہے اسی میں خبردار ہو جاویں جن کو آنکھ ہے۔ پھر سورہ انفال کے دوسرے رکوع کی ۱۷ آیت میں مسطور ہے کہ **فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلَـكِنَّ اللهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَـكِنَّ اللهَ رَمَى**۔ یعنی سو تم نے انکو نہیں مارا لیکن اللہ نے مارا اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک جس وقت پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی آنحضرت کی طرف سے جن لوگوں نے جنگ بدر میں اپنی جانیں دیں۔ ان کو رتبہ شہادت نصیب ہوا چنانچہ سورہ بقرہ کے ۱۹ رکوع میں یوں مندرج ہے [101] **وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ** یعنی جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کو مردے نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔

اگرچہ جنگِ بدر میں مسلمانوں کی تعداد قریش کے مقابلہ میں بہت کم تھی تو بھی انہوں نے فتح پائی اور قریش کے بعض آدمی جو آنحضرت کے سخت دشمن تھے۔ میدانِ جنگ میں مارے گئے لہذا اس فتح کی تاویل کے باب میں تائید آسمانی اور الہیٰ مداخلت کا بیان قرین قیاس (وہ بات جسے عقل قبول کرے) اور قابلِ اعتماد معلوم ہونے لگا۔ اسی فتح کے باعث آنحضرت کی زندگی محفوظ ہو گئی۔ اور جس حکمت عملی کے مطابق آپ کارروائی کرنے کے مشتاق (ماہر) تھے۔ اب بلا روک ٹوک اس پر کاربند ہو گئے اور چونکہ اقوام یہود کی اعانت (مدد) کی آپ کو اب کچھ ضرورت نہ رہی۔ اسی لئے ان کو بھی خوب دبانا شروع کیا۔ جب عرب کی بدوی قومیں آپ کی ظفریابی (کامیابی) سے واقف ہوئیں تو ان پر آپ کا رعب مسلط ہو گیا۔ اور انہوں نے آپ کو ایک فوج ظفر موج کا سپہ سالار جان کر آپ سے عہد و پیمان کی استدعا (درخواست) کی۔ ان لوگوں کو آپ کی پیغمبری اور نبوت کی چنداں پروانہ تھی۔ لیکن آپ نے ایک جنگی سپہ سالار کی حیثیت میں ان کی توجہ کو کھینچ لیا اور وہ آپ کی تعظیم کرنے لگے۔ جب کبھی کوئی فتح نصیب ہوئی تو آنحضرت نے یہی مشورہ کیا۔ کہ یہ سب آسمانی مدد اور الہیٰ تائید کا نتیجہ ہے۔ اس قسم کے دعویٰ سے آپ کی طاقت و شہرت روز افزوں (روزانہ ترقی) ہوتی گئی۔ لیکن ساتھ ہی اس قسم کے اشتہار دینا اور ایسی تدبیر پر چلنا اور از حد خطرناک تھا۔ کیونکہ جب کبھی آپ شکست کھاتے تھے تو طبعی طور پر جو نتیجہ نکل سکتا تھا وہ یہی تھا کہ خُدا نے آپ کو ترک کر دیا۔ چنانچہ کچھ مدت بعد ایسے موقعوں پر فی الحقیقت لوگوں نے یہی نتیجہ نکالا۔

جنگِ بدر میں شکست کھا کر قبیلہ قریش کے لوگ انتقام کے لئے سخت دانت پیس رہے تھے۔ دوسرے سال انہوں نے مصمم ارادہ (پکا ارادہ) کیا کہ اپنے دشمنوں کو مغلوب کرنیکے لئے ایک دفعہ پھر میدانِ جنگ میں صف آرا (مقابلہ کرنے والا) ہوں۔ چنانچہ ۶۲۵ء کے موسم بہار میں پہلے کی نسبت کسی قدر زیادہ فوج فراہم کر کے مدینہ کے قرب و جوار (ارد گرد) میں جا اُترے۔ اب حضرت محمد نے دانشمندی سے ہر چند چاہا کہ قریش پر حملہ نہ

---

[100] یعنی جنگ بدر میں حضرت محمد کی نبوت کا ایک نہایت صریح اور صاف ثبوت دیا گیا چنانچہ کان لکم ایۃ کے تشریح کے باب میں مفسر حسین فرماتے ہیں کہ شمار اعلامتے ونشانے درست بر نبوت محمد۔

[101] تحقیق معلوم نہیں کہ آیا یہہ آیت جنگ بدر سے علاقہ رکھتی ہے یا جنگ اُحد سے مفسر حسین فرماتے ہیں کہ در روز بدر جان شیریں بداد واز نعمت حیات ولذت نصیم دنیا محروم شد۔ عبداللہ ابن عباس جملہ يُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے بیان میں فرماتے ہیں کہ يُقْتَلُ فی طاعتِ للّٰهِ یوم بدر یعنی جنگ بدر میں خدا کی فرمانبرداری کرتے ہوئے مارے گئے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں مندرج ہی کہ شہیدوں کی روحیں خدا کے حضور ان سبز پرندہ کے جسم میں داخل ہوتی ہیں جو کہ بہشت میں اِدھر اُدھر پرواز کرتے اور عرش الٰہی کے گرداگرد کی قندیلوں کے پاس بسیرا کرتے ہیں (دیکھو خلاصۃ التفاسیر جلد اول صفحہ ۹۶ واں)

کرے بلکہ خود حفاظتی کے لئے مسلح رہے لیکن آپ کے بعض ناتجربہ کار اور سرگرم مومنین نے آپ کو اس تدبیر پر عمل کرنے سے باز رکھا اور کہنے لگے کہ بدوی اقوام کے دلوں میں اب آپ کی طاقت اور بالادستی کے رعب داب کا سکہ بیٹھ چکا ہے۔

اور اس لئے اس وقت حملہ نہ کرنا بزدلی کا اظہار ہوگا۔ آپ کی مشکلات کے وقت مدد آسمانی اور تائید الہٰی پر شبہ کیا جائیگا۔ آسمانی مدد آنحضرت کی من جانب اللہ رسالت کا ایسا ثبوت مانی گئی تھی۔ کہ اگر اب کسی امر میں آپ ذرا بھی شک وشبہ ظاہر کرتے۔ تو آپ کی تمام شہرت خاک میں مل جاتی۔ آخر الامر آپ نے قریش کے ساتھ معرکہ آرا ہونا منظور کر لیا۔ اور مومنین کو فرمایا کہ اگر تم استقلال (مضبوطی) سے لڑو گے تو خُدا تعالیٰ تم کو ا فتح مندی بخشیگا[102]۔

کچھ عرصہ تک بہت سی چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ لیکن جب دونوں فوجیں اچھی طرح غٹ پٹ (باہم لڑائی میں گتھ جانا) ہوئیں تو مسلمانوں نے بہت بُری طرح شکست کھائی۔ اور آنحضرت خود بھی سخت زخمی ہوئے اور نہایت ناراض ہو کر فرمانے لگے کہ وہ قوم کس طرح ترقی کریگی۔ اور اس کا کیونکر بھلا ہوگا جس نے اپنے نبی کے ساتھ جو خُدا کی طرف بلاتا ہے۔ ایسی بدسلوکی کی؟ جنہوں نے پیغمبر خُدا کے چہرہ کو خون[103] آلودہ کیا۔ ان پر خُدا کے غضب کی آگ نازل ہو۔ قریش کی فوج ظفر موج نے اب فتح احد سے تسکین حاصل کی اور بجائے اس کہ ہزیمت یافتہ مومنین کا تعاقب کرے مکہ کی طرف روانہ ہوئی اور جنگ احد کا خاتمہ ہوا۔

جو مسلمان جنگ احد میں کام آئے تھے احادیث میں انہیں شہدا بیان کیا ہے لیکن اس شکست کی صاف تاثیر (اثر) یہ تھی۔ کہ مومنین نہایت مغموم (غمزدہ)[104] اور مصیبت زدہ ہوگئے۔ جنگِ بدر میں جو آنحضرت کو فتح نصیب ہوئی تھی۔ اس کو آپ نے اس قدر تائید الہٰی اور آسمانی مدد سے منسوب کیا تھا۔ کہ اب احد کی شکست سے خواہ مخواہ یہ خیال مسلط ہونے لگا کہ خُدا تعالیٰ آنحضرت کی مدد و یاروی سے دست بردار ہوگیا۔ خصوصاً یہودیوں نے اس دلیل پر بہت زور دیا اور کہنے لگے۔ کہ حضرت محمد شاہی جاہ و جلال کی دھن میں مستغرق (غرق شُدہ) ہو رہے ہیں۔ اور کسی طرح سے وہ اپنے آپ کو اس سے برّی نہیں کر سکتے۔ آج تک کسی سچے نبی کی یہ حالت نہیں ہوئی کہ اس نے حضرت محمد کی طرح میدانِ جنگ میں شکست کھائی ہو اور آنحضرت کی طرح اپنے مومنین سمیت مجروح وزخمی ہو کر میدان جنگ سے گریزاں[105] ہوا ہو۔ اب اس امر کی ضرورت پڑی کہ آنحضرت ہر طرح کی تدابیر وتقریر سے یہودیوں کے اعتراضات کا کافی جواب دیں۔ اور بعض مسلمانوں کے مخفی (پوشیدہ) اور دلی شکوک کو رفع کریں۔ چنانچہ آپ نے نہایت ہوشیاری سے وحی آسمانی کو پیش کیا۔ اور فرمایا کہ جنگ احد میں شکست کے اسباب یہ تھے۔ کہ اکثر مومنین کے درمیان باہمی لڑائی جھگڑے اور نااتفاقی تھی۔

---

[102] میور صاحب نے جنگ احد کا حال نہایت مفصل اور شرح لکھا ہے۔ دیکھو Muir's life of Muhammad جلد سوم صفحہ ۱۶۰ وا

[103] دیکھو Muir's life of Muhammad کی جلد سوم کے ۱۷۵ صفحہ پر مقتبسات واقدی۔

[104] قبیلہ قریش کے لوگوں نے مسلمانوں کی اس شکستہ دلی کو غنیمت جانا اور ان کو آنحضرت سے برگشتہ کرنیکے لئے کوشش کرنے لگے۔ اس کے مقابلہ میں آنحضرت بھی خاموش نہ تھے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کرنا یھا الذین امنو آن تطیعوا الذین کفر وا یر دو کمہ علیٰ اعقابکمہ ذتنقلبو اخسرین یعنی اے ایمان والو اگر تم کہا مانوگے منکروں کا تو تم کو پھیر دینگے الٹے پاؤں پھر جا پڑوگے نقصان میں (دیکھو سورہ آل عمران رکوع 16) مفسر حسین فرماتے ہیں کہ منافقوں نے سچے مسلمانوں کو اسلام سے روگردان ہونیکی ترغیب دی اور کہنے لگے کہ حضرت محمد کی نبوت کا زمانہ گذر گیا ہے اور کفار ان پر غالب آگئے ہیں سو بہتر ہے کہ اب پھر اپنے پرانے مذہب کو اختیار کرو چنانچہ تفسیر حسینی کے ۷۵ صفحہ میں یوں مندرج ہے کہ منافقان مومنان را میگفتند کہ ایں زمان پیغمبر گذشتہ شد رایت دولت کفارہ استیلا یافت شمارا دیگر بارہ دیں خود رجوع باید کر۔

[105] دیکھو Muir's life of Muhammad کی جلد سوم کے ۱۸۹ صفحہ پر مقتبسات واقدی۔

سپہ سالاروں کا حکم نہیں مانتے تھے اور اپنی شخصی حفاظت اور سلامتی کے خواہاں تھے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے ۱۶ رکوع کی آیت ۱۵۲ میں یوں مرقوم ہے۔ **وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِ حَتَّى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ** یعنی اللہ تو سچ کر چکا تم سے اپنا وعدہ جب تم لگے ان کو کاٹنے اس کے حکم سے جب تک تم نے نامردی کی اور کام میں جھگڑا ڈالا اور بے حکمی[106] کی بعد اس کے کہ تم کو دکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز۔ کوئی تم میں سے چاہتا تھا دنیا اور کوئی تم میں سے چاہتا تھا آخرت[107] پھر تم کو الٹ دیا ان پر سے اس واسطے کہ تم کو آزماوے۔

پھر بیان کیا جاتا ہے کہ خُدا تعالیٰ نے مومنوں کے اخلاص اور ان کے ایمان کی صحت کی آزمائش کی غرض سے یہ شکست بھیجی تھی۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے ۱۴ اور ۱۷ رکوع میں مندرج ہے۔ کہ **إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّهُ الَّذِينَ آمَنُواْ وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاء وَاللّهُ لاَ يُحِبُّ الظَّالِمِينَ وَلِيُمَحِّصَ اللّهُ الَّذِينَ آمَنُواْ وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُواْ الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّهُ الَّذِينَ جَاهَدُواْ مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلاَّ رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللّهُ الشَّاكِرِينَ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَن تَمُوتَ إِلاَّ بِإِذْنِ اللّهِ كِتَابًا**[110] **مُّؤَجَّلاً وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَن يُرِدْ ثَوَابَ الآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُواْ لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَمَا ضَعُفُواْ وَمَا اسْتَكَانُواْ وَاللّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ۔** یعنی محمد تو ایک رسول ہے ہو چکے پہلے اس سے بہت رسول پھر کیا اور وہ مر گیا یا

---

[106] حکم رسول کے یا حکم سردار عبداللہ بن جبیر کے (خلاصۃ التفاسیر جلد اوّل صفحہ ۳۱۱)۔

[107] بیضاوی کہتا ہے کہ بعض محارمین صفوف جنگ سے اپنا مقام چھوڑ کر لوٹ مار میں مصروف ہو گئے تھے اور بعض رسول اللہ کے حکم کے مطابق اپنی اپنی جگہ جمے رہے۔

[108] بیضاوی کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر جنگ احد میں وہ تم پر غالب آ گئے ہیں تو جنگ بدر میں تم ان پر غالب آ چکے ہو۔

[109] بیضاوی کے بیان کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے کہ خُدا اور اصل منکروں کی مدد نہیں کرتا بلکہ بعض اوقات ان کو محض اس غرض فتح مند کر دیتا ہے کہ تا کہ ان کو امتحان میں ڈالے اور مومنین کو آزمائے۔

[110] ان آیات میں آنحضرت کی جنگ احد میں فرضی موت کی طرف اشارہ ہے اور اس میں جو استدلال کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اگر حضرت محمد میدان جنگ میں مارے بھی جاتے تو مومنین کے لئے مناسب نہ تھا کہ اسلام کو ترک کریں۔ کیونکہ پہلے تمام نبی مر گئے پر ان کے دین باطل و منسوخ نہیں ہوئے بلکہ قائم رہے۔ محدثین کا بیان ہے کہ جب آنحضرت جنگ احد میں زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے تو مومنین یوں پکار کر کہنے لگے کہ اگر محمد صاحب مر گئے ہیں تو کچھ عجیب بات نہیں ہوئی خُدا زندہ ہے وہ کبھی نہیں مرتا۔ اس کا پیغمبر اپنا کام ختم کر چکا تم اپنے ایمان کی خاطر لڑو لیکن منافقین کہنے لگے کہ چونکہ محمد مر گیا ہے آؤ ہم اپنے گھروں کو واپس چلیں Muir's life of Muhammad جلد سوم کے صفحہ نمبر ۱۷۳ مقتبسات واقدی۔

بیضاوی بیان کرتا ہے کہ ابن قمیہ نے آنحضرت کے علم بردار مسعب بن عمر کو قتل کیا یہ سمجھ کر کہ میں نے محمد کو مار ڈالا ہے زور سے پکار اٹھا کہ میں نے محمد کو قتل کر دیا ہے۔ یہ سن کر مسلمان میدان سے بھاگ نکلے۔ لیکن آنحضرت نے ان کو پکارا اور کہا کہ اے خُدا کے بندو میری طرف آؤ پر منافقین نے کہا اگر محمد خُدا کا نبی ہوتا تو مارا نہ جاتا آؤ ہم اپنے بھائی بندوں اور اپنے پرانے دین کی طرف واپس چلیں ان آیات کے ترجمہ پر عبدالقادر کا حاشیہ اور تفسیر حسینی کا صفحہ نمبر ۸۵ ملاحظہ کیجئے۔

مارا گیا تو پھر جاؤ گے الٹے پاؤں اور جو کوئی پھر جائیگا الٹے پاؤں وہ نہ بگاڑ یگا اللہ کا کچھ اور اللہ ثواب دیگا بھلا ماننے والوں کو اور کوئی جی مر نہیں سکتا بغیر حکم اللہ کے لکھا ہوا وعدہ اور بہت نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں بہت خُدا کے طالب[111] پھر نہ ہارے ہیں کچھ تکلیف پہنچنے سے اللہ کی راہ میں نہ سست ہوئے ہیں نہ دب گئے ہیں اور اللہ چاہتا ہے ثابت رہنے والوں کو۔

پھر آنحضرت نے مسئلہ تقدیر اور شیطانی تاثیرات کے متعلق تعلیم دے کر اپنے مطلب کی تاویلات کو بہم پہنچایا۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے ۱۷ رکوع کی آیت ۱۶۰ میں یوں مرقوم ہے کہ **إِن يَنصُرْكُمُ اللهُ فَلاَ غَالِبَ لَكُمْ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ وَعَلَى اللهِ فَلْيَتَوَكِّلِ الْمُؤْمِنُونَ**۔ یعنی اگر اللہ تمہاری مدد کریگا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا۔ اور جو وہ تم کو چھوڑ دیگا پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کریگا۔ اس کے بعد اور اللہ پر بھروسہ چاہیئے مسلمانوں کو۔ اس آیت سے آنحضرت نے یہ بات سمجھائی کہ اگر خُدا تمہاری مدد کرے جیسی کہ اس نے جنگِ بدر میں کی تو تم پھر غالب آسکتے ہو پر اگر وہ تم کو چھوڑ دے جیسا کہ اس نے جنگِ احد میں چھوڑ دیا تم ضرور شکست کھاؤ گئے۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے ۱۵ اور ۱۶ رکوع اور سورہ حدید کے ۳ رکوع میں یوں مندرج ہے کہ **وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلاَّ بِإِذْنِ اللهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلاً إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْاْ مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا**۔ یعنی کوئی جی مر نہیں سکتا بغیر حکم اللہ کے لکھا ہوا۔ جو لوگ تم میں ہٹ گئے جس دن بھڑیں دو فوجیں سو ان کو ڈگا دیا شیطان نے کوئی آفت نہیں پڑی ملک میں اور نہ آپ تم میں جو نہی لکھی ایک کتاب[112] میں پہلے اس سے کہ پیدا کریں ہم اس کو۔

آخر الامر جو لوگ جنگِ احد میں مارے گئے تھے ان کو حضرت محمد نے خطاب شہادت سے ممتاز (سرفراز) کیا۔ اور ان کی جزا میں مبالغہ (کسی بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا) کرتے کرتے ان کو آسمانی افواج میں شریک کر دیا۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے ۱۷ رکوع میں مندرج ہے۔ کہ **وَلاَ تَحْسَبَنَّ**[113] **الَّذِينَ قُتِلُواْ فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاء عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللهُ مِن فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُواْ بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلاَّ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللهَ لاَ يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ**۔ یعنی تو نہ سمجھ جو لوگ مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے بلکہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے۔ خوشی کرتے اس پر جو دیا اللہ نے اپنے فضل سے اور خوشوقت ہوتے ہیں انکی طرف سے جو ابھی نہیں پہنچے ان میں پیچھے سے اس واسطے کہ ڈر ہے ان پر نہ ان کو غم۔ خوش وقت ہوتے ہیں اللہ کی نعمت اور فضل سے اور اس سے کہ اللہ ضائع نہیں کرتا مزدوری ایمان والوں کی۔

---

[111] لفظ ربیون کے معنی عالم اور نیکوکار کے بھی ہیں محدثین وکاین من نبی قتل معہ ربیون کثیر کے ترجمہ کے باب میں لکھتے ہیں کہ بسا پیغامبر کہ قتال کردند کفار ہمراہ وخُدا پرستان بسیار عبداللہ ابن عباس کے نزدیک ربیون کثیر کے معنی جموع کثیر اور حسین کے نزدیک سپاہ فراوان ہیں۔ خلاصۃ التفاسیر میں یوں لکھا ہے کہ آپ سے پہلے پیغمبر گذرے جن کے ساتھ اللہ والے لڑتے تھے۔ ابن کثیر ابو عمر اور یعقوب وغیرہ قاری قاتل (لڑایا قتل کیا) کی جگہ قتل (لڑائی کیا گیا یا قتل کیا گیا) پڑھتے ہیں اور بعض کے نزدیک قتل صحیح ہے سوا گران قراتوں کے مطابق خیال کیا جاوے تو پہلی سورۃ میں جو معنی ہونگے وہ یہ ہیں کہ بسا اوقات نبی قتل کیا گیا جبکہ نیکوکار ولوگ اس کے ہمراہ تھے۔ دوسری صورت میں یہ ہے کہ بسا اوقات نبی نیکوکاروں کے ساتھ مارا گیا۔ پس اس طرح اس آیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ نبی نیکوکار لوگوں سے لڑتا تھا بلکہ یہ کہ نیکوکار لوگ نبی کے ساتھ ہو کر لڑتے اور دشمنوں کو قتل کرتے تھے یا نبی کے ساتھ ہی قتل کئے جاتے تھے درحالیکہ وہ نبی کے ساتھ ہوتے تھے تو بھی نبی قتل کیا جاتا تھا۔

[112] نولدیکی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب آنحضرت سخت مصیبت میں مبتلا تھے اور اس سے صاحب موصوف نتیجہ نکالتے ہیں کہ یہ ساری سورۃ ہی جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھی۔ مفسرین اسلام اس آیت کو کسی خاص واقعہ کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ اس کے عام معنی لیتے ہیں۔ حسین بیان کرتا ہے کہ اس سے کال وقحط مالی نقصانات بیماری اور افلاس مراد ہیں جو کہ پہلے ہی لوح محفوظ میں مرقوم ہیں۔ دیکھو تفسیر حسینی جلد دوم صفحہ ۳۸۱۔

[113] احادیث میں شہیدوں کی بہشتی فرخندہ فالی وخوشحالی کی نسبت نہایت عجیب وغریب حکایات مندرج ہیں آنحضرت نے خود فرمایا کہ جب مومنین احد میں شہید ہوئے اللہ تعالیٰ نے ان کی روح سبز پرندوں کے بدنوں میں کر دی جو جنت کی نہروں اور میووں سے کھاتے پیتے ہیں (خلاصۃ التفاسیر جلد اوّل صفحہ ۳۲۰ اور ۳۲۱) مفسر معالم فرماتے ہیں کہ اس آیت میں شہیدان بدر کی طرف اشارہ ہے اور اس سے شہیدان احد مراد نہیں ہیں۔

سورہ آل عمران کے آخر میں ایک مغلق المضمون (مشکل مضمون) سی آیت پائی جاتی ہے۔ جس سے آنحضرت پر یہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ اگرچہ ساکنان مکہ کو جنگ احد کے وقت سے کافی آزادی حاصل ہے۔ اور وہ اپنے تجارتی کاروبار کے لئے بلا روک ٹوک ادھر ادھر شہروں میں آتے جاتے ہیں تاہم آپ کو بیدل ہونا اور کسی طرح سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے چنانچہ لکھا ہے۔ کہ **لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ**[114] **الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ**۔ یعنی تو نہ بہک اس پر کہ آتے جاتے ہیں کافر شہروں میں۔ یہ فائدہ ہے تھوڑا سا پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور کیا بُری تیاری ہے۔

ان حالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ احد میں مسلمانوں نے ایسی شکست فاش کھائی تھی۔ کہ عرب کے بُت پرست لوگ بے خوف اپنے معمولی کاروبار کے لئے ادھر ادھر آتے جاتے تھے۔ اس سے آنحضرت بہت بیدل ہونے لگے۔ اور آپ کے مومنین کی بھی ہمت ٹوٹنے لگی۔ لہذا آنحضرت کی ہمت بڑھانے اور آپ کے مریدوں کی دلجمعی کرنے کے لئے مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔

سورہ آل عمران[115] اس مضمون کی آیات سے پُر ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ان حالات کے باعث نہایت مشکل میں تھے۔ اور آپ نے نہایت جانفشانی سے کوشش کی کہ احد کی شکست سے جو خطرات متصور ہو سکتے تھے۔ ان کو مدینہ سے دفع کریں اور ان کے تدفیعہ (دُور کرنا) کے وسیلہ سے اپنے مریدوں کو استقلال (مضبوطی) بخشیں۔

علاوہ اس کے یہ سورۃ اس امر کی ایک نہایت عمدہ اور صریح نظیر (واضح مثال) ہے۔ کہ جب مسلمان اپنی خستہ حالی اور بربادی کے باعث بیدل ہو جاتے اور ہمت ہار بیٹھتے تھے۔ تو ان کی تسلی و تشفی کے لئے کس عجیب طور سے عین وقت پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر بعد پھر آنحضرت کو کامیابی کی امید ہو گئی۔ کیونکہ جنہوں نے جنگ احد میں پیٹھ دکھائی تھی ان کو آپ نے خوب دھمکایا[116] اور ملامت کی اور بیان فرمایا کہ اب ضرور اسلام غالب آئیگا۔ اور صرف دین اسلام ہی کل دُنیا کا دین قرار پائیگا۔ چنانچہ سورۃ صف کی ۹ آیت میں یوں مندرج ہے۔ **هُوَ**[117] **الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ**۔ یعنی وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول راہ کی سوجھ لے کر سچا دین کہ اس کو اوپر کرے دینوں سے سب سے اور پڑے برا مانیں شرک کرنے والے۔

---

[114] **تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ** کے معنوں کے باب میں مفسر عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ذھاب الیھود والمشرکین فی تجارۃ یعنی یہودیوں اور مشرکوں کا ادھر ادھر تجارت کی غرض سے آنا جانا۔ تفسیر حسینی کی پہلی جلد کے ۱۹۵ صفحہ میں مفسر حسین لکھتے ہیں باید کہ فریب ندہد ترا رفتن و آمدن کافران در شہر ہا برائے تجارت۔

[115] آنحضرت کی نظر میں یہ سورۃ احد قابل قدر تھی چنانچہ آپ نے فرمایا کہ جو کوئی سورہ آل عمران کو پڑھیگا اس کو ہر ایک آیت کے ثواب میں یہ حق حاصل ہوگا کہ پل صراط سے سلامت گذر جاوے۔ Chrestomathia Baidowania صفحہ نمبر ۱۴۲۔

[116] یا ایھا الذین امنوا لمہ تقولون ما لا تفلحون لبر مقتا عندالله ان تقولوما لا تفلحون ان یحب الذین یقاتالون فی سبیلہ صفاً کانھم بنیان مرصوص۔ یعنی اے ایمان والو کیوں کہتے ہو منہ سے جو نہیں کرتے۔ بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو۔ اللہ چاہتا ہے ان کو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر جیسے وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی۔

[117] اس آیت کے آخری حصّہ کا مطلب مفسر حسین کے نزدیک یہ ہے کہ اسلام کا غلبہ عین اسی وقت ہوگا جب سیدنا عیسیٰ مسیح دوبارہ تشریف لائینگے چنانچہ تفسیر حسینی کی دوسری جلد کے ۴۰۰ صفحہ میں یوں مرقوم ہے کہ تا غالب گرداند ریں دین راہ بر ہمہ کیش و ملت بوقت نزول عیسیٰ کہ ہم اہل زمین و دین اسلام قبول کنندہ۔ دوسرا مصنف کہتا ہے کہ اس آیت میں اشارہ ہے کہ اسلام ناسخ ادیان ہے۔

جنگ احد[118] کے بعد دونوں فوجیں باہم یہ دھمکی سنا کر کہ اگلے سال میدانِ بدر میں پھر دیکھینگے میدان جنگ سے روانہ ہوئیں۔ دوسرے سال جب وقت آیا تو قبیلہ قریش کے لوگ بہت سی فوج لے کر حسب وعدہ بدر کی طرف روانہ ہوئے لیکن گرمی کی شدت اور تمازت (شدت کی گرمی) آفتاب کی تاب نہ لا کر مکہ کی طرف واپس چلے گئے۔

سو جب آنحضرت اپنے بہادروں سمیت بدر میں پہنچے تو وہاں قریش کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ آپ نے آٹھ یوم تک بدر میں قیام کیا اور آپ نے مال واسباب کو فروخت کرنے سے بہت سا نفع اٹھایا۔ اس نیک فرجامی (انجام) کے باب میں جس کے عوض میں سخت کشت وخون (قتل وغارت) کی امید تھی۔ فی الفور وحی کا نزول ہوا۔ چنانچہ سورہ آل عمران کے اٹھارویں رکوع میں یوں مسطور ہے۔ **الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ فَانقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ** یعنی جن لوگوں نے حکم مانا اللہ کا رسول کا بعد اس کے کہ ان میں پڑ چکا[119] تھا کٹاؤ۔ جو ان میں نیک ہیں اور پرہیز گار ان کو ثواب بڑا ہے۔ جن کو کہا لوگوں نے کہ انہوں نے جمع کیا اسباب تمہارے مقابلے کو سو تم ان سے خطرہ کرو۔ پھر ان کو زیادہ آیا ایمان اور بولے بس ہے ہم کو اللہ اور کیا خوب کارساز ہے۔ پھر چلے[120] آئے اللہ کے احسان سے اور فضل[121] سے کچھ۔ نہ پہنچی برائی اور چلے اللہ کی رضا پر اور اللہ کا فضل[122] بڑا ہے اور یہ جو ہے سو شیطان[123] ہے کہ ڈراتا ہے اپنے دوستوں سے۔ سو تم مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر ہو تم ایمان والے۔

قریش کے علاوہ چند دیگر اقوام پر بھی آپ نے کئی بار حملے کئے۔ ان میں سے سوائے ایک کے جس میں آپ نے صلوٰۃ الخوف کے قوانین کو قائم کیا کوئی بھی قابل ذکر نہیں ہے۔[124] جب فوج کا ایک حصّہ نماز میں مشغول (مصروف) ہوتا تھا۔ تو دوسرا حفاظت کے لئے تیغ برہنہ (ننگی تلوار لیے) کھڑا

---

[118] اب بعض مومنین نے آنحضرت کو صلاح دی کہ یہود نصاریٰ سے دوستی پیدا کریں لیکن وحی آسمانی نے اس سے رد کر دیا چنانچہ سورہ مائدہ کے رکوع ۸ کی پہلی آیت میں یوں مرقوم ہے **يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ** ترجمہ: اے ایمان والو مت پکڑو یہود نصاریٰ کو رفیق۔ وہی آپس میں رفیق ہیں ایک دوسرے کے اور جو کوئی تم میں ان سے رفاقت کرے وہ انہیں میں ہے۔ اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو۔

[119] جنگ احد کی ہزیمت وشکست کی طرف اشارہ ہے۔

[120] یعنی میدان بدر سے بغیر لڑنے اور تکالیف وخطرات جنگ کو برداشت کرنے کے واپس آئے۔

[121] یا تو مومنین یہاں لوٹ کے مال سے مالامال ہوئے یا بیضاوی کے بیان کے مطابق وہاں ایک بڑا بھاری میلہ تھا اور انہوں نے خرید وفروخت کر کے بہت نفع حاصل کیا۔

[122] یعنی ان کو ایمان کی مضبوطی بخشے اور دشمنوں کے مقابلہ میں استقلال وشجاعت عطا فرمانے میں دیکھو بیضاوی کی تفسیر قرآن۔

[123] تحقیق معلوم نہیں کہ یہ شیطان سے کون مراد ہے۔ ابن عباس اور بیضاوی دونوں مفسروں کا خیال ہے کہ اس سے نعیم جو مسلمانوں کو ڈرانے کی کوشش کرتا تھا یا ابوسفیان قریشی سردار مراد ہے۔

[124] سورہ نساء کے رکوع ۱۵ میں مندرج ہے **وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ ۖ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ ۖ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا** یعنی اور جب تو ان میں ہو پھر ان کو نماز میں کھڑا کرے تو چاہیے ایک جماعت ان کی کھڑی ہو تیرے ساتھ اور ساتھ لیویں اپنے ہتھیار پھر جب یہ سجدہ کر چکیں تو پرے ہو جاویں اور آوے دوسری جماعت جس نے نماز نہیں کی۔ وہ نماز کریں۔ اس امر کے مفصل بیان کے لئے Sell's Faith of Islam صفحہ نمبر ۲۷۱ ملاحظہ فرمائیں۔

رہتا تھا۔اس وقت سے قرآن ایک ذریعہ قرار پایا۔ حرب وضرب (لڑائی وار) کی تمام خبریں اور ہر طرح کے فوجی احکام خُدا تعالیٰ کی طرف سے براہ راست قرآن ہی کی معرفت تمام معاملات طے ہونے لگے۔

بعض اوقات آنحضرت کی خانگی زندگی (گھریلو زندگی) کے متعلق آپ کو راستکار (ایماندار) قرار دینے کی غرض سے بھی وحی کا نزول ہوتا تھا۔ جو آسمانی فیصلے آپ کے اس وقت کے مدنی معاملات سے علاقہ (تعلق) رکھتے ہیں۔ان سے اس امر کی بخوبی تشریح ہو جائیگی اگرچہ ان کا واقعی طور پر وقوع میں آنا ۶۲۶ء میں اور جنگِ احد کے بعد زمانہ میں بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ اپنے متبنی (بیٹا بنایا ہوا۔لے پالک) زید کے گھر تشریف لے گئے۔اور اسکی زوجہ زینب کے حسن وجمال کو دیکھ کر اس پر ایسے فریفتہ اور بیدل ہوئے۔ کہ بس پھر نہ سنبھلے زید فی الفور زینب کو طلاق دے کر آنحضرت کی نظر کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن آپ نے فرمایا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھ اور خُدا سے ڈر۔پر زید ایک صاحب بصیرت شخص تھا۔اس نے زینب کو طلاق دیدی۔عام طور پر آنحضرت کا زینب کو سلکِ زوجیت میں منسلک کرنا کچھ بڑی بات نہ تھی۔اور شاید اس سے آپ کے نام پر کسی طرح کا کوئی دھبانہ لگتا۔ لیکن کسی شخص کا اپنے متبنی کی بیوی سے شادی کرنا گو اس نے طلاق بھی دیدی ہو اہلِ عرب کی نظروں میں نہایت گھناؤنا اور مکروہ تھا۔ بمصداق ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم۔آنحضرت زینب کے بغیر کب رہ سکتے تھے۔ وحی کا نازل کرانا تو اپنے ہاتھ میں تھا۔ شادی رچادی اور الیٰ منظوری کے ثبوت میں ایک آیت پڑھ سنائی۔ یہ ایک ضروری امر تھا کہ پہلے آپ متبنوں کی بیویوں سے نکاح کرنے کے متعلق لوگوں کے عام اعتراضات کو خُدا کے نزدیک نامعقول قرار دیں۔ چنانچہ سورہ احزاب کی چوتھی آیت میں یوں مرقوم ہے **وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ** یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے نہیں بنایا۔

اہلِ عرب کے دستور اور ان کی مروجہ رسومات کے لحاظ سے حضرت محمد کا زید سے ایسا رشتہ تھا جیسا کہ باپ کا اپنے حقیقی بیٹے سے ہوتا ہے۔ لیکن اسلام نے خُدا کے حکم سے اس رشتہ کو برطرف وبالائے طاق رکھ دیا۔جب آپ کے لئے یہ ایک عام اصول قائم ہو گیا تو پھر زینب کے معاملہ میں آپ کے سامنے کوئی مشکل باقی نہ رہی۔اور اہل عرب کے خیالات کو آسمانی اختیار سے ہیچ (نکما) اور بے ہودہ ثابت کرنیکے دعویدار ہوئے۔ چنانچہ سورہ احزاب کے رکوع ۵ کی آیت ۳۷،۳۸ میں یوں مرقوم ہے۔**وَإِذْ تَقُولُ لِلَّذِي أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَأَنْعَمْتَ عَلَيْهِ أَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللَّهَ وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ فَلَمَّا قَضَى زَيْدٌ مِنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنَاكَهَا لِكَيْ لَا يَكُونَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَرَجٌ فِي أَزْوَاجِ أَدْعِيَائِهِمْ إِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا مَا كَانَ عَلَى النَّبِيِّ مِنْ حَرَجٍ فِيمَا فَرَضَ اللَّهُ لَهُ**۔یعنی اور جب تو کہے اس شخص کو جس پر اللہ نے احسان[125] کیا اور تو نے احسان[126] کیا رہنے دے اپنے پاس اپنی جورو اور ڈر اللہ سے اور تو چھپاتا اپنے دل میں ایک چیز جو اللہ اس کو کھولا چاہتا ہے اور ڈرتا[127] تھا لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہئے ڈرنا تجھ کو۔ پھر جب زید تمام کر چکا اس عورت سے

---

125 یعنی اس کو مشرف باسلام ہونے کی اجازت وتوفیق بخشی۔

126 اسکو اپنا متبنی بنایا۔

127 تفسیر حسینی اور صحیح البخاری میں مذکور ہے کہ اللہ مبدیہ سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ زینب آخر کار آپ کے نکاح میں آئیگی اور تخشی الناس سے یہ مراد ہے کہ حضرت محمد اہل عرب کی رسومات کی خلاف ورزی سے ڈرتے تھے کیونکہ ان کے دستور کے مطابق متبنی کی بیوی سے نکاح کرنا ناجائز تھا۔چنانچہ صحیح بخاری کی تیسری جلد کے ۳۱۲ صفحہ میں مندرج ہے وتخفی فی نفسلمہ اللہ مبدیہ نزلت فی شان

اپنی غرض ہم نے وہ تیرے نکاح میں دی تا نہ رہے سب مسلمانوں پر گناہ نکاح کر لینا اپنے لے پالکوں کی جوروؤں سے جب وہ تمام کریں ان سے اپنی غرض اور ہے اللہ کا حکم کرنا۔ نبی پر کچھ مضائقہ (ہرج) نہیں اس بات میں جو ٹھہرا دی اللہ نے اس کے واسطے۔

پھر آنحضرت کو یہ ایک اور مشکل آئی کہ زینب آپکی حقیقی پھوپھی امینہ کی بیٹی تھی۔ وحی کے وسیلہ سے پھر آپ کو اور خاص حق جس سے آپ کے سب مرید محروم تھے عطا ہوا۔ اور اس سے یہ مشکل بھی رفع دفع ہو گئی۔ چنانچہ سورہ احزاب کے چھٹے رکوع کی آیت ۵۰ میں یوں مرقوم ہے۔ **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي آتَيْتَ أُجُورَهُنَّ وَمَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ مِمَّا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَيْكَ وَبَنَاتِ عَمِّكَ وَبَنَاتِ عَمَّاتِكَ وَبَنَاتِ خَالِكَ وَبَنَاتِ خَالَاتِكَ اللَّاتِي هَاجَرْنَ مَعَكَ وَامْرَأَةً مُؤْمِنَةً إِن وَهَبَتْ نَفْسَهَا لِلنَّبِيِّ إِنْ أَرَادَ النَّبِيُّ أَن يَسْتَنكِحَهَا خَالِصَةً لَّكَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ**۔ یعنی اے نبی ہم نے حلال رکھیں تجھ کو تیری عورتیں جن کے مہر تو دے چکا اور جو مال ہو تیرے ہاتھ کا جو ہاتھ لگاوے تجھ کو اللہ اور تیرے چچا[128] کی بیٹیاں اور پھوپھیوں کی بیٹیاں اور تیرے ماموں کی بیٹیاں اور خالاؤں کی بیٹیاں جنہوں نے وطن چھوڑا تیرے ساتھ اور کوئی عورت[129] جو مسلمان ہو کر بخشے اپنی جان نبی کو اگر نبی چاہے کہ اس کو نکاح میں لے یہ نرمی ہے تجھی کو سوائے سب مسلمانوں کے۔

چونکہ زینب اور اس کا بھائی آنحضرت کی اس کاروائی میں رضامند نہ تھے۔ اس لئے سورہ احزاب کے رکوع ۵ کی آیت ۳۶ میں خُدا کی طرف سے آپ نے ان کو یوں ملامت (لعن طعن) کی۔ **وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَن يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُّبِينًا**۔ یعنی اور کام نہیں کسی ایماندار مرد کا[130] نہ عورت کا جب ٹھہراوے اللہ اور اس کا رسول کچھ کام کہ ان کو رہے اختیار اپنے کام کا اور جو کوئی بے حکم چلا اللہ کے اور اس کے رسول کے سو راہ بھولا صریح چوک کر۔

اس آیت سے معاملہ طے ہو گیا اور زینب کے ساتھ آنحضرت کا نکاح جائز قرار دیا گیا۔ اسی سورۃ میں ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت کو اس وقت موجودہ نو بیویوں کے علاوہ کسی اور سے نکاح کرنے سے منع کیا گیا۔ لیکن ساتھ ہی آپ کو یہ اجازت ملی کہ جس قدر عورتیں رکھنی

---

ابنته حجش و زید ابن حارثة ۔ تفسیر حسینی کی دوسری جلد کے صفحہ ۲۰۱ میں یوں مرقوم ہے کہ تخفی فی نفسا وپنہاں میکردی در نفس خود ما اللہ مبدیہ آنچہ خُدا پیدا کنندہ آن است یعنی آنزا کہ زینب داخل ازدواج طبیات تو خواہد۔ و تخشی الناس و ترسیدی از سرزنش مردم کہ گویند زن پسر خواندہ بخواست۔

128 مفسر حسین صاف فرماتے ہیں کہ بنت عمتک میں زینب کی طرف اشارہ ہے چنانچہ تفسیر حسینی کی دوسری جلد کے صفحہ ۲۰۴ میں اس کے بیان میں یوں مرقوم ہے کہ دختران عمہائے تو از اولاد عبدالمطلب۔ یہ آیت آنحضرت کے زینب سے نکاح کرنیکے وقت یعنی ۶۲۶ء سے بعد کی ہے اور آنحضرت کے کردہ کو دائرہ جواز میں لاتی ہے اور لونڈی کا حوالہ بنی قرئضہ کے قتل کی طرف اشارہ کرات ہے جو کہ ۶۲۷ء میں واقع ہوا تھا جبکہ آنحضرت نے اپنی پہلے پہل اسیر کردہ عورتوں میں سے ریحانہ کو اپنے حرمین شریفین میں داخل کیا تھا۔

129 سورۃ النساء میں جو دوسرے مسلمانوں کے لئے حدود اور قواعد مقرر کئے گئے ہیں ان سے اس کے وسیلہ سے آنحضرت معذور رکھے جاتے ہیں۔

130 مفسر بالاتفاق اس مرد و عورت سے زید و زینب مراد لیتے ہیں چنانچہ ترمذی اور معالم اور دوسری تفاسیر میں مروی ہے کہ یہ آیت زینب کے حق میں نازل ہوئی۔ دیکھو خلاصۃ التفاسیر جلد سوم صفحہ ۵۵۹ تفسیر ابن عباس کے ۴۸۴ صفحہ پر مرقوم ہے کہ لمومنٍ زید لامومنة زینب۔ مفسر حسین بھی کہتا ہے کہ اس سے زینب ہی مراد ہے۔ دیکھو تفسیر حسینی جلد دوم صفحہ ۲۰۱ ومن یعص اللہ ورسولہ پر حسین بہت زور دیتا ہے اور قرآن و سنت کو متساوی الحیثیت قرار دیکر یوں لکھتا ہے کہ ہر کہ عاصی شود مخالفت کند خُدا تعالیٰ و رسول اللہ او یا از حکم کتاب و سنت بگذرو۔

چاہیں حرموں کے طور پر رکھ لیں۔ چنانچہ اس امر کے جواز کے باب میں قرآن میں یہ فقرہ مندرج ہے کہ ما ملکت ایمینک۲*[131] یعنی جو مال ہو تیرے ہاتھ کا اس وقت اس بات کے طول طویل بیان کی کچھ ضرورت نہیں۔ سورۃ النساء جو کہ ۴ یا ۵ ہجری میں نازل ہوئی تھی۔ اس کی تیسری آیت میں عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ حرموں کے علاوہ ایک ہی وقت چار سے زیادہ بیویاں نہ رکھیں۔ اور جس آیت میں آنحضرت کے لئے نو کی حد ٹھہرائی گئی ہے وہ اسکے بعد نازل ہوئی تھی۔

پھر کچھ مدت بعد قریباً ۸ یا ۹ ہجری میں آنحضرت کے خانگی معاملات (گھریلو معاملات) کے متعلق حضرت جبرائیل یعنی وحی آسمانی لپکتے ہوئے آئے۔ اس وقت سے کچھ عرصہ پیشتر ملکِ مصر کے رومی حاکم نے ایک نہایت خوبصورت و حسین و نوخیز لونڈی آپ کی نذر کی تھی۔ وہ آنحضرت کے نخل (درخت) مراد سے باردار ہوئی اور ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اور آپ نے اس کا نام ابراہیم رکھا۔ اب آنحضرت کی دیگر زوجات مطہرات کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ آنحضرت کی ایک کرتوت آپ کی زوجات میں سے حفصہ کو معلوم تھی۔ اور آپ نے اس کو یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی تھی۔ لیکن اس نے عائشہ کو بھی بتادیا اس سے آپ سخت ناراض ہوگئے۔ خانگی تنازعہ بڑھتا گیا اور آپ کو مناکحت (نکاح) کے باب میں الہیٰ منظوری اور رضامندی کی ضرورت پڑی اور آپ کی کارروائیوں کو دائرہ مباحات (جائز ہونا) میں لانے اور جو آپ نے اپنی[132] زوجات مطہرات کے آرام و آسائش کی بابت قسمیہ عہد کیا ہوا تھا۔ اس سے مخلصی بخشنے کے لئے جبرائیل پیغام لائے۔ چنانچہ سورہ تحریم کی پہلی آیتوں میں یوں مندرج ہے۔ **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ**۔ یعنی اے نبی تو کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر چاہتا ہے تو رضامندی اپنی عورتوں کی اور اللہ بخشنے والا مہربان۔ ٹھہرا دیا ہے اللہ نے تم کو کھولڈالنا تمہاری قسموں کا اور اللہ صاحب ہے تمہارا اور وہی ہے سب جانتا حکمت والا۔

۵ ہجری میں قبیلہ قریش کے لوگوں نے پھر بڑے زور و شور سے چڑھائی کی اور شہر مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔ جس قدر محاصرین نے زور دیا۔ اسی قدر بعض مسلمان بیدل ہوگئے اور ہمت ہار بیٹھے۔ چنانچہ سورہ احزاب کی ۱۰ اور ۱۱ آیت میں اس محاصرہ کا بیان اور اسکے خطرات کا نقشہ کھینچ کر یوں پیش کیا گیا ہے۔ **إِذْ جَاؤُوكُم مِّن فَوْقِكُمْ وَمِنْ أَسْفَلَ مِنكُمْ وَإِذْ زَاغَتِ الْأَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّونَ بِاللَّهِ الظُّنُونَا هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا**۔ یعنی جب آئے تم پر اوپر کی طرف سے اور نیچے سے اور جب ڈگنے لگیں آنکھیں اور پہنچے دل گلوں تک اور اٹکلنے لگے تم اللہ پر کئی کئی اٹکلیں۔ وہاں جانچے گئے ایمان والے اور جھڑ جھڑائے گئے زور جھڑ جھڑانا۔

اب حضرت محمد ﷺ بالکل عاجز و بے بس معلوم ہوتے تھے۔ اور جو لوگ شہر کی حفاظت کے لئے باہر نکل کر قریش کو شہر میں داخل ہونے سے روک رہے تھے ان کے دلوں میں آپکی موعودہ آسمانی مدد کی نسبت شکوک پیدا ہوگئے۔ اور وہ کام چھوڑ کر شہر میں آجانے پر آمادہ ہوگئے۔ چنانچہ اسی سورۃ کی ۱۲، ۱۳، ۱۴ اور ۱۷ آیات میں ان کو یوں سرزنش (ملامت) کی گئی ہے۔ **وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا وَإِذْ قَالَت طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ يَا أَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوا وَيَسْتَأْذِنُ فَرِيقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ إِنَّ**

---

[131] کہتے ہیں کہ یہ آیت پہلی آیات سے منسوخ ہوگئی ہے۔ اس آیت پر سیل صاحب کا حاشیہ اور خلاصۃ التفاسیر جلد سوم کے ۵۷۸ صفحہ کو ملاحظہ فرمائے خلاصۃ التفاسیر کے بیان کی تصدیق کے باب میں کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی لہذا بیان تنقیح مشکوک اور غیر معتبر ہے۔

[132] Muir's life of Muhammad کی چوتھی جلد کے ۱۶۰ سے ۱۶۳ صفحہ تک اس کا مفصل بیان مندرج ہے۔ نیز تفسیر حسینی جلد دوم کا ۴۱۱ صفحہ ملاحظہ فرمائیے۔

**بُيُوتَنَا عَوْرَةٌ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ إِن يُرِيدُونَ إِلَّا فِرَارًا قُل لَّن يَنفَعَكُمُ الْفِرَارُ**۔یعنی اور جب کہنے لگے منافق (ریاکار) اور جن کے دلوں میں روگ ہے جو وعدہ دیا تھا ہم کو اللہ نے اور اسکے رسول نے سب فریب تھا اور کہنے لگے ایک ان میں سے اے یثرب والو تم کو ٹھکانا نہیں سو پھر چلو۔ اور رخصت مانگنے لگے ان میں ایک لوگ نبی سے اور کہنے لگے ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں اور وہ کھلے نہیں پڑے۔ غرض اور نہیں مگر بھاگنا تو کہہ کام نہ آویگا تم کو بھاگنا۔

قریش نے یکایک اچانک محاصرہ سے ہاتھ اٹھالیا۔ اور آنحضرت نے مسلمانوں کو حوصلہ بڑھانیکے لئے خُدا کی طرف سے ایک اور پیغام جیسا کہ سورہ احزاب کے تیسرے رکوع میں مرقوم یوں مرقوم ہے۔**وَرَدَّ اللَّهُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوا خَيْرًا**۔یعنی اور پھیر دیا اللہ نے منکروں کو اپنے غصہ میں بھرے ہاتھ نہ لگی کچھ بھلائی۔

اب ایک سالار قوم کی حیثیت میں آنحضرت کی طاقت قائم ہوگئی اور آپ نے اپنی قومیت اور بالادستی کا دعویٰ کیا اور یہ حکم دیا کہ سب لوگ آپ کی عزت و توقیر کریں۔ اور بڑے ادب سے پیش آئیں۔ چنانچہ سورہ نور کے رکوع ۹ کی آیت ۶۳ میں لکھا ہے کہ **لَا تَجْعَلُوا دُعَاءَ الرَّسُولِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُم بَعْضًا**۔یعنی مت[133] ٹھہراؤ بلانا رسول کو اپنے اندر برابر اس کے جو بلاتا ہے تم میں ایک کو ایک۔

قریش نے جنگ بدر میں شکست کھائی فتح احد میں مسلمانوں کا تعاقب (پیچھا) نہ کیا اور اب مدینہ سے محاصرہ میں بھی ناکامیاب رہے۔ بہت سی عربی اقوام نے ترغیب و تحریص (لالچ۔ حرص) یا کرپا شمشیر محمدی (محمدی تلوار) سے خوف زدہ ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ یہودی لوگ کچھ قتل ہوئے کچھ جلاوطن کئے گئے۔ اور جو باقی ماندہ تھے ان کی طاقت و جمعیت (گروہ) ٹوٹ گئی۔ پر اہلِ مکہ تاحال آنحضرت کی کچھ پرواہ نہ کرتے تھے۔ اگرچہ آپ اپنے آپ کو فتح اور بنی آدم کا حاکم سمجھتے تھے۔ اس تمام عرصہ میں حضرت محمد کو قریش کے ہاتھ سے مصائب و تکالیف پہنچتی رہیں۔ لیکن اب انتقام و مکافات کا دن قریب آگیا۔ اس وقت آنحضرت کی توجہ شہر مکہ کی طرف مبذول (لگایا گیا) ہوئی۔ کیونکہ جب تک آپ مکہ میں[134] مختار کل (مکمل بااختیار) اور مطلق العنان (بے لگام) نہ ہوتے تب تک آپ کو عرب کی شاہنشاہت کا خیال کرنا بیجا ہوس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اب آپ کو اپنے مکی مومنین سمیت مکہ سے نکلے ہوئے پورے چھ برس گذر چکے تھے۔ اور ان میں اکثر بعض مکی مقامات کی زیارت کے بصد جان مشتاق (شوقین) تھے۔ علاوہ ازیں کچھ عرصہ سے حضرت محمد نے قبلہ کی بھی تبدیلی کر لی تھی۔ اب بجائے یروشلم کے مکہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔

جو مسلمان مدینہ میں جا بسے تھے۔ ان کی نظر میں تاحال کعبہ کی بہت کچھ تعظیم و تکریم تھی۔ اگرچہ عرصہ چھ سال سے وہ کعبہ کی زیارت سے محروم تھے۔ تاہم وہ ہر روز نماز کے وقت کعبہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے۔ ان کے دلوں میں حرم کعبہ میں داخل ہونے اور اس کا طواف کرنیکا شوق ازبس اشتداد پر تھا۔ اب عین وقت پر آنحضرت نے ایک خواب دیکھا جس میں اپنے تئیں تمام مومنین سمیت فرائض حج کو ادا کرتے ہوئے پایا۔ اس خواب کے وسیلہ سے راستہ کھل گیا۔ اور چونکہ ماہ محرم الحرام (جس میں عمرہ ہوتا ہے) نزدیک تھا۔ اسلئے مسلمانوں کی ایک متعدد جماعت[135] مکہ

---

[133] راڈویل صاحب کے قرآن ۵۸۶ صفحہ کے حاشیہ نمبر ۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال آپکا راویوں سے اڑایا ہوا تھا۔

[134] سورۃ الحج کے نزول کی نسبت ٹھیک فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی بعض آیات ایام مکہ آخری دنوں سے تعلق رکھتی ہیں لیکن بعض اس وقت کی مدنی معلوم ہوتی ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کے دل میں جمع کعبہ کے خیالات کس قدر زور مار رہے تھے۔ تاحال کعبہ پر اہل مکہ ہی قابض تھے ان کو کعبہ کی بے حرمتی کے باعث دھمکایا اور ۲۸ آیت کے مطابق آپ کو حکم ہوا کہ لوگوں کو حج کے لئے پکاریں چنانچہ لکھا ہے کہ اذن فی الناس بالحج یاتوک رجالا و علیٰ کل ضامر یاتین کل حج عمیق یعنی پکار لوگوں میں حج کے واسطے کہ آویں تیری طرف پاؤں چلتے اور سوار ہو کر دبلے دبلے اونٹوں پر چلے آتے راہوں دور سے۔

[135] Muir's Life of Muhammad جلد چہارم صفحہ ۲۴ تا ۲۵۔

کی طرف روانہ ہوئی۔ قریش نے ان کو شہر میں داخل ہونے سے[136] روکا اور دونوں طرف سے ایلچی آنے جانے لگے۔ مقام حدیبہ میں مسلمانوں کی حالت کسی قدر خطرناک تھی۔ حضرت محمد نے سب مومنین کو ایک درخت کے سایہ میں اپنے سامنے جمع کیا۔ اور ہر ایک سے یہ عہد لیا کہ خواہ اس کو اپنی جان بھی دینی پڑے وہ آپکا ساتھ نہیں چھوڑیگا۔ سبھوں نے بخوشی تمام قسمیہ عہد کیا اور یہ عہد عہد الشجر کے نام سے نامزد ہوا۔ زمانہ بعد میں اس عہد کی طرف بسا اوقات اشارہ کیا گیا۔ اور اس کی بہت کچھ قدر و منزلت بھی کی گئی ہے۔ اس امر کی توضیح (واضح کرنا) کے لئے کہ آنحضرت کے مومنین نے اپنے آپ کو آپ پر نثار کر چھوڑا تھا۔ اور ان کے درمیان ہمدردی بدرجہ کمال تھی۔ مذکورہ بالا عہد نہایت عمدہ اور صریح دلیل (واضح ثبوت) ہے۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے خُدا تعالیٰ بہت خوش ہوا چنانچہ سورہ فتح کے تیسرے رکوع کی پہلی آیت میں یوں مندرج ہے۔ **لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ**۔ یعنی اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب ہاتھ ملانے لگ[137] گے تجھ سے اس درخت کے نیچے۔

تاہم باہمی صلاح و مشورہ کا نتیجہ یہ تھا کہ قریش نے مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے کی مطلق اجازت نہ دی اور مفصلہ ذیل شرائط پر اکتفا ہوئی:

(۱) دس سال تک کوئی لڑائی نہ ہوگی اور طرفین میں سے کوئی فریق فریق ثانی (دوسرے) پر حملہ آور نہ ہوگا اور کامل اتحاد و دوستی قائم رکھی جائیگی۔ (۲) اگر کوئی شخص قریش سے حضرت محمد کے ساتھ ملنا چاہے یا کوئی حضرت محمد کو چھوڑ کر قریش میں شامل ہونا چاہے تو اس کے لئے کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ (۳) اگر کوئی شخص اپنی قوم کے[138] سردار کی اجازت کے بغیر حضرت محمد سے جا ملے۔ تو حضرت محمد نے اس کو واپس بھیج دینگے اور اسی طرح اگر کوئی مسلمان قریش میں واپس آجائے تو قریش اس کو حضرت محمد کے پاس واپس بھیجیگی۔ بشرطیکہ حضرت محمد اپنے مومنین سمیت واپس چلے جائیں اور اس سال شہر مکہ میں داخل نہ ہوں۔ نیز قریش نے آنحضرت سے اقرار کیا کہ آئندہ ہم آپ کو مومنین سمیت شہر مکہ میں تین یوم تک جبکہ باہر چلے جائینگے داخل ہونے سے نہیں روکیں گے بشرطیکہ کسی کے پاس سوائے تلوار کے اور کوئی ہتھیار نہ ہو اور وہ تلوار[139] بھی میان میں ہو۔

---

136 بعض علماء کا خیال ہے کہ سورہ بقرہ کے رکوع ۱۴ کی دوسری آیت وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ یعنی اور اس سے ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ پڑھے وہاں نام اس کا۔ اور دوڑا ان کے اجاڑنے کو۔ ایسوں کو نہیں پہنچتا ہے کہ بیٹھیں ان میں مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کو دنیا میں ذلت ہے اور ان کو آخرت میں بڑی مار ہے اسی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اگر یہ خیال درست ہو تو یہ آیت سورہ بقرہ سے بعد کی ہے اور پیچھے اس میں داخل کر دی گئی ہے۔ اس امر میں مفسرین کا اتفاق نہیں۔ حسین کہتا ہے کہ اس سے یروشلم کی ہیکل کی بربادی مراد ہے جو تائیتس رومی حاکم کے ہاتھ سے وقوع میں آئی تھی اور لفظ مساجد (جو کہ جمع ہے عزت و تعظیم کی راہ سے مسجد (واحد) کی جگہ استعمال کیا گیا ہے دیکھو تفسیر حسینی صفحہ ۱۹۔ خلاصۃ التفاسیر کے صفحہ ۶۴ پر مختلف بیان پائے جاتے ہیں اور منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ اس میں تائتیس کی طرف جو عیسائی کہلاتا تھا اشارہ ہے لیکن دوسرے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے وہی مزاحمت مراد ہے جو قریش نے کی اور مسلمانوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روکا۔ چنانچہ مفصل طور پر مندرج ہے کہ اے قریش تم نے مکہ معظمہ کی مسجد سے اللہ کے پیغمبر کو نکال دیا اور مومنین کو عبادت و ذکر خُدا سے روکا اور اس سبب سے کہ عبادت و ذکر کعبہ میں موقوف رہا تم اس کے ویران اور خراب کرنے میں ساعی ٹھہرے۔

137 اس عہد کا نام بیعۃ الرضا لکھا ہے۔

138 اس شرط میں ذکور و اناث کوئی تشخیص نہیں بلکہ یہ شرط مذکر و مونث دونوں پر یکساں عائد ہوتی ہے لیکن جب آنحضرت مکہ سے مدینہ کی طرف واپس چلے آئے تو اس کے تھوڑی دیر بعد ایک قریشی جوان آپ سے آملا اور قریش کے دعویٰ کرنے پر آپ نے اسے واپس دیدیا پھر ایک عورت اسی طرح آگئی اور اس کے بھائی آپ کی خدمت میں مدینہ پہنچے اور آپ سے درخواست کی کہ اسے ان کے حوالہ کر دیں۔ آنحضرت نے خُدا کا حکم پیش کیا اور عورت کو ان کے حوالے کرنے سے صاف انکار کیا۔ چنانچہ سورہ ممتحنہ کی ۱۰ آیت میں مرقوم ہے **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ** یعنی اے ایمان والو جب آویں تم پاس ایمان والی عورتیں وطن چھوڑ کر تو ان کو جانچ لو۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان کا ایمان پھر اگر جانو کہ وہ ایمان پر ہیں تو نہ پھیرو ان کو کافروں کی طرف یہ عورتیں حلال ان مردوں کو نہ وہ حلال ان عورتوں کو۔ فقرہ **فَامْتَحِنُوهُنَّ** کی نسبت مفسرین کا بیان ہے کہ ان عورتوں کا اس امر میں امتحان کرنیکا حکم ہوا تھا کہ آیا وہ فی الحقیقت اسلام قبول کرنیکی غرض سے وطن چھوڑ کر آئی ہیں یا کسی اور غرض سے کیونکہ صرف اسی حالت میں کہ وہ اسلام کی خاطر آئی ہوں آنحضرت کو انہیں اپنے پاس رکھنا جائیز تھا۔ لیکن اس حالت میں بھی آپ اپنے منظور کردہ عہد و پیمان کی خلاف ورزی کر رہے تھے اس بیان سے آنحضرت کی ذاتی خوبی اور قرآن کے متدارج نزول کے صفحہ ۱۵۴۔ فوائد کی بخوبی تشریح ہوتی ہے۔

139 Muir's Life of Muhammad جلد چہارم صفحہ ۳۴

اس عہد وپیمان سے پہلے تو مسلمان بہت مایوس ہوگئے اور خیال کرنے لگے کہ مکہ آنے میں کچھ فائدہ نہ ہوا[140]۔ لیکن حضرت محمد نے فوراً خُدا کی طرف سے وحی کا پیغام سنایا اور سمجھایا کہ عہد حدیبیہ سے ہم کو بہت فائدہ ہوا ہے جو مسلمان اس کے برعکس خیال کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ چنانچہ آپ نے اونٹ پر کھڑے ہوکر یوں فرمایا کہ انا افتحا الک فتحا مبینا یعنی ہم نے پہلے فیصلہ کردیا تیرے واسطے صریح فیصلہ (سورہ فتح پہلی آیت)۔

قریش نے آنحضرت سے ایسا سلوک کرنے سے گویا آپ کو ملکی رتبہ کے لحاظ سے اپنا ہمسر تسلیم کیا۔ ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ جب لڑائی موقوف (ختم) ہوگئی اور لوگ امن وچین کی حالت میں ایک دوسرے سے ملنے جلنے لگے تو اثنائے گفتگو (گفتگو کے دوران) میں جن جن سلیم الطبع (نرم دل) اشخاص نے اسلام کے اوصاف مانے اور اسکی خوبیوں کو دیکھا فی الفور مسلمان ہوگئے۔ فی الواقعہ اس وقت سے اسلام کی ترقی نہایت سریع (تیز) ہوگئی۔ جن لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا ان کو سخت لعنت ملامت کی گئی۔ اور انہیں اس بات سے آگاہ کیا گیا کہ اگر وہ ایمان نہیں لائینگے۔ تو آتش دوزخ ان کی خاطر بھڑک رہی ہے۔ چنانچہ سورہ فتح کے پہلے رکوع میں مرقوم ہے۔ اعدلھم جھنم یعنی تیار کی ان کے واسطے دوزخ۔ اور بالمقابل اس کے جنھوں نے آنحضرت سے درخت تلے عہد کیا تھا ان کو امن وچین فتح قریب اور بہت سے مال غنیمت کا وعدہ عنایت ہوا۔ چنانچہ تیسرے رکوع کی پہلی دوسری آیات میں اس طرح مندرج ہے۔ **لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًاوَمَغَانِمَ كَثِيرَةً**۔ یعنی اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب ہاتھ ملانے لگے تجھ سے اس درخواست کے نیچے۔ پھر جانا جو ان کے جی میں تھا۔ پھر اتارا ان پر چین اور انعام دی ان کو ایک فتح نزدیک اور بہت غنیمتیں (مفت ملی ہوئی چیزیں)۔ مومنین آنحضرت کی مذکورہ بالا خواب کا خیال کرکے تعجب (حیرانگی) کرنے لگے کہ اس کے پورا ہونے کی کیا وجہ ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس کے پورا ہونیکا سال نہیں بتلایا گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک آسمانی پیغام پیش کرکے خواب کے پورا ہونیکی نسبت مومنین کی تسلی کردی۔ چنانچہ سورہ فتح کے چوتھے رکوع کی آیت ۲۷، ۲۸ میں یوں مرقوم ہے۔ **لَقَدْ صَدَقَ اللَّهُ رَسُولَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ إِن شَاء اللَّهُ آمِنِينَ مُحَلِّقِينَ رُؤُوسَكُمْ وَمُقَصِّرِينَ لَا تَخَافُونَ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوا فَجَعَلَ مِن دُونِ ذَلِكَ فَتْحًا قَرِيبًاهُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا**۔ یعنی اللہ نے سچ دکھایا اپنے رسول کو خواب تحقیق تم داخل ہورہوگے ادب والی مسجد میں اگر اللہ نے چاہا چین سے۔ بال مونڈتے اپنے سروں کے اور کترتے بے خطرہ۔ پھر جانا جو تم نہیں جانتے۔ پھر ٹھہرادی اس سے ایک فتح نزدیک۔ وہ ہے جس نے بھیجا پیغمبر اپنے کو ساتھ ہدایت کے اور دین حق کے اوپر رکھے اس کو ہر دین سے اور بس ہے اللہ ثابت کرنے والا۔

جیسا اُوپر بیان ہوا ہے کہ اگرچہ حج ملتوی ہوگیا پر مسلمان فتح مند ہوئے۔ اور چونکہ ہدایت ورہبری آنحضرت کو تفویض (سپردگی) کی گئی۔ اس لئے وہ اب صبر سے انتظار کرنے لگے۔ کہ یہ ساری باتیں کب پوری ہوتی ہیں۔ اسلام کا جاہ وجلال بہت بڑھنے والا تھا اور دین عیسوی ومذہب یہود کو اس سے ہمسری (برابری) کا دعویٰ نہ رہا۔ دین اسلام ہی تمام[141] دینوں سے افضل اور نجات کا وسیلہ قرار پایا۔ لہذا مومنین کے لئے اب یہ بات کچھ مشکل نہ

---

[140] مذکور ہے کہ حضرت محمد کو اہل مکہ پر اعتماد نہ تھا اور آپ نے یہ اجازت دی کہ اگر وہ عہد وپیمان حدیبیہ کی شرائط پر قائم نہ رہیں تو بے شک تلوار سے کام لیا جائے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے ۲۴ رکوع میں اس کا بیان مفصل طور پر مندرج ہے۔ اگرچہ یہ آیت اسی وقت کی نہیں ہیں تو ضرور بعد میں یہاں داخل کی گئی ہیں (دیکھو تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ ۳۲واں)۔

[141] چنانچہ سورہ آل عمران کے رکوع 9 میں یوں مندرج ہے یعنی جو کوئی چاہے سوائے اسلام کے دین سو اس سے ہر گز نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خراب ہے۔ تفسیر حسینی کی جلد اوّل کے ۷۵ صفحہ پر یوں لکھا ہے کہ ایں آیت تہدید جمعی است کہ طالب غیر دین اسلام اند ودر شان آنہا کہ بعد وصول بشرف اسلام دست از دامن دین متین باز وادارند مرتد شوند۔ پھر خلاصتہ التفاسیر کی جلد اوّل کے ۲۷ صفحہ پر یوں مرقوم ہے جو سوائے دین اسلام کے کوئی اور دین اختیار کرے۔ یہودیت یا نصرانیت یا کچھ ہو کو منظور ومقبول نہ ہوگا اور وہ اپنی سعی اور کوشش میں محروم ومخذول رہیگا۔ اس آیت نے تمام دینوں کو منسوخ کردیا جو گذر گئے یا پیدا کئے جائیں۔ اس مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تمام بنی آدم کے لئے اسلام کی اطاعت وانقیاد کا وجوب ساکنان مدینہ کے سامنے اب صاف طور سے پیش کیا گیا تھا۔

تھی کہ اپنی آرزوؤں کے پورا کرنیکے لئے ایک سال تک اور انتظار کریں۔ان کے لئے یہ جاننا کافی تھا کہ خُدا کی مرضی یوں ہی ہے۔سورہ فتح اوّل سے آخر تک قابلِ غوراور آنحضرت کی ضرورت کے لئے اس کا نزول عین حسبِ موقع معلوم ہوتا ہے۔

صرف اسلام ہی کے حقیقی اور سچے دین ہونے کا یہ خاص دعویٰ سورہ آل عمران ابتدائی زمانہ کی مدنی سورۃ ہی کے دوسرے رکوع کی آیت ۱۹میں بھی بیان ہو چکا ہے۔چنانچہ لکھا ہے۔کہ **إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللهِ الإِسْلاَمُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوْتُواْ الْكِتَابَ إِلاَّ مِن بَعْدِ مَا جَاءهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ** یعنی دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی حکم برداری اور مخالفت نہیں کتاب والے مگر جب ان کو معلوم ہو چکا آپس کی ضد سے۔

تفسیروں[142] میں مذکورہ بالا آیت کا مطلب یوں بیان کیا جاتا ہے کہ صرف اسلام ہی سچا دین ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت۔ اور یہود و نصاریٰ نے اسلام کو اس وقت رد کیا جبکہ قرآن نازل ہوا۔ اور وہ بھی انہوں نے یا تو از راہ حسد کیا یا اسلئے کہ ان کو فوق (سبقت) حاصل رہے۔

جب آنحضرت مکہ سے لوٹ کر مدینہ میں آئے اس وقت سے آپکی طاقت بڑھتی گئی۔ اور اس ترقی کے خیال سے سرشار ہو کر اپنے خواب کی تاویل کے میدان کو بہت وسیع کرنے لگے۔ چنانچہ سورۃ الاعراف کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت میں یوں مرقوم ہے۔ **قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا**۔ یعنی تو کہہ اے لوگو میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف۔

مندرجہ بالا آیت سے موثر ہو کر ۶۲۷ یا ۶۲۸ء میں آپ نے مختلف ممالک میں مسیحی فرمانرواؤں اور ہیراقلیس (Heraclius) شاہ قسطنطنیہ اور شاہ ایران وغیرہ کے پاس پیغام بھیجے۔ نولدیکی صاحب فرماتے ہیں کہ ان خطوط میں آپ نے مسیحی حاکموں کو اسلام کی طرف بلانے اور اپنی نبوت و صداقت رسالت کا اظہار کرنیکی غرض سے ذیل کی آیات تحریر فرمائیں۔ یعنی تو کہہ اے کتاب والو آؤ ایک سیدھی بات پر ہمارے تمہارے درمیان کی بندگی نہ کریں۔ ہم مگر اللہ کو اور شریک نہ ٹھہراویں اس کا کسی چیز کو اور نہ پکڑیں آپس میں ایک ایک کو رب سوائے اللہ کے۔

پھر اگر وہ قبول نہ رکھیں تو کہو شاہد (گواہ) ہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں۔ اے کتاب والو کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم[143] پر اور توریت اور انجیل تو اُتریں اس کے بعد کیا تم کو عقل نہیں۔ سنتے ہو تم لوگ جھگڑ چکے جس بات میں تم کو خبر ہے اب کیوں جھگڑتے ہو۔ جس بات میں تم کو خبر نہیں؟ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ نہ تھا ابراہیم یہودی اور نہ تھا نصرانی لیکن تھا ایک طرف کا حکم بردار اور نہ تھا شرک والا (سورہ آل عمران رکوع ۷) یوں بھی کہتے ہیں کہ یہ آیات اس وقت نازل ہوئی تھیں جب نجران کے عیسائی اپنے بشپ کے ساتھ حضرت محمد کی ملاقات کے لئے آئے تھے۔ اس ملاقات کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ انہوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا[144]۔

اب چونکہ حضرت محمد قریش کے حملات سے محفوظ اور بالکل بے خوف تھے اسلئے بے تحاشا مختلف بدوی اقوام کو لوٹ مار کر گزارہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ عمرہ یعنی حج صغرا کا وقت آگیا اور ۶۲۹ء کے موسم بہار میں آپ نے قریش کی منظوری سے استفادہ (فائدہ) حاصل کیا اور قریباً دو ہزار مومنین کو ساتھ لے کر مکہ جا پہنچے۔ قریش کے لوگ شہر سے باہر آگئے اور مسلمان اپنے آلاتِ حرب (لڑائی کے آلات) باہر رکھ کر سات سال بعد شہر میں داخل ہوئے جب آنحضرت کعبہ میں پہنچے تو فرمانے لگے کہ اے خُدا مکہ کے لوگوں کے دلوں میں آج میرے رعب کو مسلط کر دے۔ پھر آپ نے رسومِ حج مثلاً حجرِ اسود کو بوسہ دینے کعبہ کا سات مرتبہ طواف کرنے اور کوہ صفا و مروہ کے درمیان دوڑنے کو عربی بُت پرستوں کے دستور کے مطابق پورا کیا۔ جو جانور آپ قربانی کی غرض سے لے گئے تھے ان کو ذبح کیا۔ اور اس حج کی رسومات سے فارغ ہوئے۔ جب آپ نے شہر مکہ اور خانہ کعبہ کی اس قدر تعظیم و تکریم کی۔ تو اہل مکہ کے دل آپ کی جانب کسی قدر مائل ہو گئے اور آپ کے فوجی جاہ و جلال کو دیکھ کر قریش کے دو سپہ سالار آپ سے آملے۔ پھر آپ نے میمونہ سے نکاح کر کے قریش سے اتحاد بڑھایا۔ اس مقام پر یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسی سال کے اندر اندر میمونہ چوتھی عورت تھی جو آپ

---

142 تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ ۶۲ پر یوں مرقوم ہے کہ دین پسندیدہ نزدیک خُدا دین اسلام است نہ یہودیت و نصرانیت واختلاف نہ کروند آنکہ دین اسلام حق است و محمد رسول پیغمبر بحق آنانکہ دادہ اند بدیشاں کتاب یعنی توریت و انجیل مگر پس از انکہ آمد بدیشاں دانشے بحقیقت امر یعنی قرآن بدیشاں فرود آمد۔ پھر خلاصتہ التفاسیر جلد اوّل کے ۲۴۱ صفحہ میں مندرج ہے کہ سوائے اسلام کے اور کوئی طریقہ مقبول نہیں جیسا فرمایا من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ اسلام کے سوا دوسرا دین جو اختیار کرے نہ مانا جائیگا۔

143 کہ آیا ابراہیم یہودی تھا یا نصرانی۔

144 Muir's Life of Muhammad جلد دوم صفحہ ۲۹۹ سے ۳۰۲ تک۔

کے حرمین شریفین میں داخل ہوئی۔ آخرکار آنحضرت پھر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اور اب آپ کو ہر طرح سے اس قدر قوت وطاقت حاصل ہوئی کہ اس سے پیشتر کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

اب حضرت محمد نے معلوم کیا کہ ساکنان مکہ جنگ وجدل سے تنگ آگئے ہیں۔ قریش کے اکثر سپہ سالار گئے اور باقی ماندوں میں سے بہت آنحضرت سے آملے۔ تمام عرب میں آپ کی طاقت روزافزوں (روزانہ ترقی کرنا) ہورہی تھی۔ اور اب آپ کے لئے ممکن تھا کہ استقلال وثابت قدمی سے ایک سخت حملہ کرکے مکہ کو فتح کرلیں۔ اور قریش کی باقیماندہ مخالفت کو ہمیشہ کے لئے نیست ونابود کردیں۔ سورہ رعد سب سے آخری مکی سورۃ ہے۔ لیکن اس کی ۴۱ویں آیت غالباً بعد میں داخل کی گئی ہے اور اسی مذکورہ بالا موقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے چنانچہ لکھاہے کہ **اوّلمْ يَرَوْاْ أَنَّا نَأْتِي الأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا وَاللّهُ يَحْكُمُ لاَ مُعَقِّبَ لِحُكْمِهِ وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ**۔ یعنی کیا نہیں دیکھتے کہ ہم چلے آتے ہیں زمین پر گھٹاتے اس کو کناروں سے اور اللہ حکم کرتاہے کوئی نہیں کہ پیچھے ڈالے اس کا حکم۔ ابنِ عباس[145] اور بہت سے دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ یہ آیت اہل مکہ کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جو کہ ایسے اندھے اور کوتہ اندیش (کم فہم) تھے کہ ان کو اہلِ اسلام کا آناً فاناً بہت سے عربی ممالک پر مسلط ومتصرف (قابض) ہوتے جانا گویا نظر ہی نہیں آتا تھا۔ مگر مفسر حسینؓ*[146] فرماتے ہیں کہ اس میں یہودیوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن کی اراضیات (زمینیں) قلعے اور مقبوضات اہل اسلام کے قبضہ میں آتے جاتے تھے۔

جب آنحضرت نے فتح مکہ کے لئے حملہ کیا تو جن لوگوں نے اس میں شامل ہونے میں بے پرواہی ظاہر کی ان کو سورہ توبہ کے دوسرے رکوع میں یوں عتاب (ناراضگی) ہوا کہ **أَلاَ تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُواْ أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّواْ بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَؤُوكُمْ اوّل مَرَّةٍ أَتَخْشَوْنَهُمْ فَاللّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤُمِنِينَقَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ**۔ یعنی کیوں نہ لڑو ایسے لوگوں سے کہ توڑیں اپنی قسمیں اور فکر میں رہیں کہ رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے چھیڑ کی تم سے۔ کیاان سے ڈرتے ہو؟ سو اللہ کا ڈر چاہئے تم کو زیادہ اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ لڑو ان سے تاعذاب کرے اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں اور سوا کرے اور تم کو ان پر غالب کرے۔

جو لوگ اس حملہ میں سرگرمی سے شریک ہوئے اور فتح مکہ کے لئے خوب جان توڑ کر لڑے۔ ان کو بہت تحسین وآفرین (تعریف کرنا) کہی اور جنہوں نے روپیہ دیا اور فتح مکہ کے بعد ترقی اسلام اور آنحضرت کی طاقت کے اظہار کے لئے لڑے۔ ان کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ نصیب ہوا چنانچہ سورہ حدید کی آیت نمبر ۱۰ میں مندرج ہے کہ[147] **مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ اوّلئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا**۔ یعنی جس نے خرچ کیا فتح سے پہلے اور لڑائی کی۔ ان لوگوں کا درجہ بڑا ہے ان سے جو خرچ کریں اس سے پیچھے اور لڑیں۔

اب آنحضرت نے چند اور عربی اقوام پر حملہ کرکے ان کو اپنا مطیع ومنقاد (طابع وفرمانبردار) بنایا۔ اور بعد ازاں سلطنت روم کے جنوبی حصّہ پر چڑھائی کی۔ لیکن جنگ مُتہ میں مسلمانوں نے سخت شکست کھائی۔ اور آنحضرت نے معلوم کیا کہ آپ کا حملہ قبل از وقت تھا ابھی وہ وقت نہ آیا تھا کہ آپ غیر ممالک کی تسخیر (قابو میں کرنا) میں مشغول (مصروف) ہوں۔ پیشتر اس کے کہ آپ غیر ممالک کو تاخت وتاراج (تباہ کرنا) کریں۔ تمام عرب میں

---

145 تفسیر ابن عباس صفحہ ۲۸۹

146 تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ ۳۴۲۔

147 نولدیکی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ آیت فتح بدر کی طرف اشارہ کرتی ہے لیکن سوائے معالم کے جو اس آیت کو عہد حدیبیہ کی طرف منسوب کرتاہے تمام مفسرین جن کے بیانات کو ہم نے دیکھا ہے اس امر پر متفق ہیں کہ یہ آیت فتح مکہ کا بیان کرتی ہے۔ جو لوگ اس معرکہ میں شامل ہوئے ان کی فضیلت وفوق کے بیان میں خلاصۃ التفاسیر جلد چہارم کے ۳۶۴ صفحہ پر یوں مرقوم ہے کہ وہ صحابی جو فتح مکہ سے پہلے مومن ومعین ہوئے دوسرے تمام مومنین بلکہ خیار امت سے افضل ہیں۔

قرار واقعی تسلط بٹھانا از حد ضروری تھا۔ چنانچہ اس وقت حضرت جبرائیل یہ پیغام لائے۔ **إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا**۔ یعنی جب پہنچ چکی مدد خُدا کی اور فیصلہ اور تو نے دیکھے لوگ داخل ہوتے اللہ کے دین میں فوج فوج۔ اب پاکی بول اپنے رب کی خوبیاں اور گناہ بخشواس سے بیشک وہ معاف کرنے والا ہے (سورہ النصر)۔

جب آپکی اس طرح ہمت بندھائی گئی تو آپ کے لئے اب شروع کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس میں کلام نہیں کہ آنحضرت کے ملکی مدبروں (عقلمندوں) کی جماعت کی یگانگت اور آپ کے مومنین کی باہمی دینی پیوستگی اور یکجہتی اس امر کی متقضی (تقاضا کرنا) تھی۔ کہ آپ کادارالحکومت بجائے مدینہ کے کوئی بہتر مقام ہو۔ اب وہ وقت آگیا تھا کہ آنحضرت کی دیرینہ اور دائمی آرزو کے مطابق اسلام ملک وملت کی ممزوجہ صورت کو غالب طور سے عرب میں اختیار کرنا چاہے تو اس کا مرکز اور صدر مقام مکہ سے بہتر کوئی نہ تھا۔ عہد وپیمان حدیبہ سے اب دو سال کا عرصہ گذر چکا تھا اور اسکی شرائط کے لحاظ سے دس سال تک مکی اور مدنی لوگوں کے درمیان کسی حالت میں لڑائی جائز نہ تھی بلکہ کامل صلح وسلامتی کا ہونا واجب تھا۔ پر یہ مشکل یوں رفع ہوگئی کہ ایک بدوی جو کہ آنحضرت کی تابعدار تھی۔ اس پر ایک دوسری قوم نے جس کا قریش سے رسوخ تھا حملہ کیا۔ اس سے آنحضرت کو فساد برپا کرنیکا موقع مل گیا۔ چنانچہ آپ نے قریباً دس ہزار محاربین کے ساتھ مکہ پر فوج کشی کی۔ ابوسفیان نے جو کہ آنحضرت کا بڑا پرانا اور جانی دشمن تھا اب دیکھا کہ مقابلہ کرنا عبث (فضول) ہے۔ چنانچہ اس نے تاب مقاومت نہ لا کر (مقابلے کی طاقت نہ رکھنا) آنحضرت سے ملاقات[148] کی استدعا کی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی کلمہ پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہوا اور اس وقت سے لے کر ہمیشہ بڑا پکا اور وفادار مسلمان رہا۔ چونکہ قریش میں ابوسفیان آباؤ اجداد کے لحاظ سے خاندانی امیر اور ذی رتبہ سر گروہ تھا اور قریش کی نظر میں بہت معزز ممتاز تھا۔

اس لئے اس کے مسلمان ہونے سے ایک طور پر گویا آنحضرت نے مکہ فتح کر لیا۔ جونہی آنحضرت نے شہر میں قدم رکھا تھا کہ عنان توجہ کو خانہ کعبہ کی طرف اٹھایا اور وہاں پہنچ کر حجر اسود کے سامنے جھکے اور اسکی تعظیم کی۔ پھر آپ کے حکم سے کعبہ کے تمام بُت ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ بُتوں کو توڑنے اور چکنا چور کرنیکے بعد آپ نے اپنا پورا اختیار جتانیکی غرض سے عثمان ابن طلحہ اور عباس کو خانہ کعبہ کے متعلق دو خاندانی اور موروثی عہدوں پر ممتاز (برتر) فرمایا۔

ایک شخص مکہ کے بازاروں میں منادی کرنے لگا کہ جو کوئی[149] خُدا کو اور قیامت کے دن کو مانتا ہے اپنے گھر میں کوئی بُت نہ رکھے بلکہ اس کو توڑ کر چکنا چور کر دے۔ اس پر بہت سے مکی اشخاص مضحکہ اڑانے لگے۔ اور تمسخر واستہزا (مذاق اُڑانا) سے پیش آئے اس وجہ سے فوراً وحی کا نزول ہوا اور آپ نے بیان فرمایا کہ طبعی طور پر سب انسان یکساں ہیں۔ خوف الٰہی کے مقابلہ میں خُدا کے نزدیک عالی خاندان اور اونچی ذات یا اعلیٰ مرتبہ کی کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔ چنانچہ سورۃ الحجرات کے دوسرے رکوع میں قریش کو یوں سرزنش کی[150] **يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ**۔ یعنی اے آدمیو ہم نے تم کو بنایا ایک نر اور ایک مادہ سے اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور گوتیں تا آپس کی پہچان ہو۔ مقرر عزت اللہ کے یہاں اس کو بڑی جس کو ادب بڑا۔

---

148 Muir's Life of Muhammad جلد چہارم صفحہ ۱۱۷ و ۱۱۸ میں اس ملاقات کا مفصل بیان مندرج ہے۔

149 Muir's Life of Muhammad جلد چہارم صفحہ ۲۹۔

150 ان خاص امور کی تشریح وتوضیح کے لئے جن کے سبب سے یہ آیت نازل ہوئی خلاصۃ التفاسیر جلد چہارم کو ۲۶۹ سے ۲۷۲ صفحہ تک ملاحظہ کیجئے۔

چند اشخاص کے سوا جنکی نسبت یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ واجب القتل[151] تھے آنحضرت نے بالعموم ساکنان مکہ کی جان بخشی کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلدی آپ نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا۔ مکہ میں مدینہ کی طرح منافقین نہ تھے۔ چنانچہ آپ کے لئے یہ نہایت شان و شکوہ اور ظفر مندی (فتح مندی) کا دن تھا۔ اس سے آٹھ برس پیشتر ایک دن وہ بھی تھا کہ آپ مکہ سے ایک حقیر و مردود بھگوڑے (کمتر۔ رد کیا ہوا۔ بھاگا ہوا) کی حیثیت میں جان بچانیکے لئے چھپ کر بھاگ گئے تھے۔ اس وقت سے قریش نے بڑے استقلال (ثابت قدمی) سے مخالفت کی۔ لیکن اب اس مخالفت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب شہر مکہ آپ کے قبضہ میں تھا اور آپ کا فرمان ہی قانون تھا۔ صدہا سال سے کعبہ لات و عزیٰ اور بہت سے دیگر بتُوں کی پرستش کا مقام تھا۔ اب آنحضرت وہاں تشریف لے گئے اور آپ کے فرمان سے ہمیشہ کے لئے کعبہ سے بُت پرستی کی یکجنی (جڑ سے اُکھاڑنا) کی گئی۔ آپ نے اپنے اختیار سے کعبہ کی حفاظت کے لئے نئے عہدہ دار مقرر کئے اور اسے نئے دین کا مرکز قرار دیا۔ ایسی بڑی کامیابی اور فتح عظیم کے بعد اسلام کا آناً فاناً ترقی کرنا اور پھیلنا کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔ آخر کار تمام باشندگان عرب ایسے متفق اور یکجہت ہوتے ہوئے معلوم ہونے لگے کہ اس سے پیشتر کبھی یہ حالت نہ ہوئی تھی اور انجام کار ان کو یہ بھی یقین ہونے لگا کہ آنحضرت ان کے سچے ہمدرد اور ملک کے خیر خواہ ہیں۔ اب عرب نے فرمانبردائی ملک اور دینی امور کی امتزاجی صورت اختیار کر کے وہ طاقت و قوت حاصل کی کہ جو دشمن اس سے پیشتر اس کو نیست و نابود کرنیکا دم مارتے تھے اب اس پر نظر کر کے لرزاں و ترساں (لرزنے والا و ترسنے والا) ہونے لگے۔

باوجودیکہ سخت مخالفین کی عداوت و دشمنی سے آنحضرت مطمئن ہو گئے۔ تو بھی بعض مقامات کے لوگ تاحال آپ کی دشمنی پر بدستور جمے کھڑے تھے۔ ہوازن فرقہ کے بدوی لوگ جن کو مکہ کے مفتوح ہونے سے ساکنان طائف کی طرح اپنی آزادی کی بربادی کا اندیشہ ہو گیا تھا۔ ان پر آنحضرت نے دو ہفتہ کے اندر اندر فوج کشی کر دی اور وادی حنین میں مقابلہ ہوا۔ پہلے تو مسلمانوں پر ہیبت چھا گئی۔ اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگنے لگے۔ اور ایسی نازک حالت ہو گئی کہ آنحضرت نے اپنے چچا عباس سے فرمایا کہ جو میدان سے بھاگ گئے ہیں ان کے اے مدینہ کے رہنے والو۔ اے عہد[152] الشجر کے وفادارو۔ اے وہ لوگو جن کا بیان سورہ بقرہ[153] میں ہوا ہے وغیرہ جملوں سے پکارا۔ اس سے بعض لوگ واپس آ کر پھر لڑنے لگے۔ جب آپ نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر کنکروں اور سنگریزوں (چھوٹے پتھروں) کی ایک مٹھی دشمنوں کی طرف پھینکی اور فرمایا کہ تم ہلاک ہو جاؤ تو لڑائی کا رنگ بدل گیا۔ اور آخر کار دشمنوں نے شکست فاش کھائی۔ اور معمول کے مطابق اس فتح کے متعلق وحی نازل ہوئی اور اس لڑائی میں پہلے مسلمانوں کا پسپا (شکست کھانا) ہونے کا یہ سبب

---

[151] قریباً دس آدمیوں کو آپ نے معاف کرنے سے انکار کیا اور ان میں چار قتل کئے گئے ان دس اشخاص میں سے ایک عبداللہ ابن سعد تھا جو کہ مدینہ میں آنحضرت کا منشی تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ آنحضرت انسان کی پیدائش کی نسبت عبداللہ سے لکھوا رہے تھے کہ "اور ہم نے بنایا ہے آدمی چن لی مٹی سے پھر رکھا اس کو بوند کر ایک جگہ ٹھہراؤ میں پھر بنائی اس بوند سے پھٹکی پھر بنائی اس پھٹکی سے بوٹی پھر بنائی اس بوٹی سے ہڈیاں پھر پہنایا ان ہڈیوں پر گوشت پھر اٹھا کھڑا کیا اس کو ایک نئی صورت میں۔ اس موقعہ پر عبداللہ نے تعجب کی راہ سے کہا یعنی بڑی برکت اللہ کی جو سب سے بہتر بنانے والا۔ آنحضرت ان الفاظ سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آسمان سے اسی طرح نازل ہوا ہے یہ بھی لکھ لو۔ عبداللہ اس پر شک لایا اور کہنے لگا کہ اگر حضرت محمد سچ کہتے ہیں تو مجھ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ چنانچہ تفسیر حسینی جلد دوم کے ۸۰ صفحے پر یوں مرقوم ہے کہ حضرت رسالت پناہ گفت بنویس کلا ہمچنیں نازل شدہ عبداللہ در شک افتادہ گشت گفت اگر محمد صادق است پس یہ من ہم وحی فرود مے آید۔ آنحضرت اسباب سے نہایت طیش میں آ گئے اور عبداللہ کی سرزنش کے لئے یہ آیت نازل ہوئی ترجمہ: یعنی اس سے ظالم کون جو یا باندھے اللہ پر جھوٹ۔ یا کہے مجھ کو وحی آئی اور اس کو وحی کچھ نہیں آئی اور جو کہے میں اتارتا ہوں برابر اس کے جو اللہ نے اتارا سورہ انعام رکوع ۱۱ یہ آیت آخری زمانہ کی ایک مکی سورۃ میں پائی جاتی ہے لیکن جس واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ مدینہ میں وقوع میں آیا تھا اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ بعد میں یہ آیت سورہ انعام میں داخل کی گئی تھی اور اس کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس سے پہلی آیت دیگر کتب مقدسہ پر قرآن کی فضیلت اور اس کے فوق کا بیان کرتی ہے اس لئے اس آیت کی واسطے یہ مناسب مقام خیال کیا گیا۔ اس میں ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ ایک شخص پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ حضرت محمد کے مقابلہ میں ویسی ہی آیات پیش کرنیکا دعویدار ہے اور آنحضرت اس پر بھی لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر قرآن خُدا کی طرف سے نہیں ہے تو اس کی مانند بنا کر لاؤ۔ کیا حضرت محمد کا یہ مطلب تھا کہ لوگ قرآن کی نظیر پیش کریں یا محض سوکھی دھمکی تھی۔

[152] اسی عہد کا نام بیعۃ الرضا ہے۔

[153] مدینہ میں پہلے پہل یہی سورۃ نازل ہوئی تھی۔

بیان کیا گیا۔ کہ وہ دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی تعداد کی زیادتی پر بہت فخر و تکبر (غرور) کرتے تھے۔ چنانچہ سورہ توبہ کے چوتھے رکوع کی پہلی آیت میں یوں مذکور ہے۔ **لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ**۔ یعنی مدد کر چکا ہے تم کو اللہ بہت میدانوں میں اور دن حنین کے جب اترائے تم اپنی بہتایت پر پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے اور تنگ ہو گئی تم پر زمین ساتھ اپنی فراخی کے پھر ہٹے تم پیٹھ دے کر۔ مسلمانوں کے اس آخری فتح میں غالب آنے اور فتحیاب ہونے کا باعث یہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ان کو آسمان سے مدد پہنچی۔ چنانچہ اسی مذکورہ بالا رکوع کی دوسری آیت میں مرقوم ہے۔ کہ **ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ**[154] **عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا**۔ یعنی پھر اتاری اللہ نے اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اور اتاریں فوجیں جو تم نے نہیں دیکھیں اور ماردی کافروں کو۔

پھر آنحضرت نے طائف کا محاصرہ کیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں باشندگان نے اپنے آپ کو آپ کے حوالہ کر دیا اور اطاعت (تابع داری) قبول کر لی۔ اب آنحضرت نے ساکنانِ مکہ اور بدوی اقوام

---

154 اصل لفظ **سَكِينَتَهُ** ہے سورہ بقرہ کے ۲۲ رکوع میں یہ لفظ استعمال ہوا جہاں سیموئیل بنی اسرائیل سے کہتا ہے کہ ترجمہ "یعنی نشان اس کی سلطنت کا یہ ہے کہ آوے تم کو صندوق جس میں ہے دلجمعی تمہارے رب کی طرف سے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کا تعلق شکینہ یا خُدا کے ظہور سے ہے جس کا عہد کے صندوق پر اظہار ہوتا تھا پس اس خوف و خطر کے وقت آنحضرت کے ساتھ خُدا کی فرضی حضوری سے تسکین حاصل ہوتی تھی۔ جب آنحضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ مکہ سے بھاگ کر ایک غار میں چھپے اور پناہ گزیں ہوئے تھے اس وقت بھی خوف خطر میں آپ کی تسلی کی خاطر فانزل اللہ **سَكِينَتَهُ** کا نزول ہوا تھا۔ دیکھو سورہ توبہ چھٹار کوع پھر چند اور واقعات کے تعلق میں یہی لفظ سورۃ الفتح کی ۴، ۱۸، ۲۶ آیات میں استعمال ہوا ہے چنانچہ یوں لکھا ہے کہ **هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا مَّعَ إِيمَانِهِمْ لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ** ترجمہ: یعنی وہی ہے جس نے اتارا چین دل میں ایمان والوں کے اور بڑھے ان کو ایمان اپنے ایمان کے ساتھ۔ اللہ خوش ہوا ایمان والوں سے جب ہاتھ ملانے لگے تجھ سے اس درخت کے نیچے پھر جانا جو ان کے جی میں تھا پھر اتارا ان پر چین اور انعام دی ان کو ایک فتح نزدیک۔ جب رکھی منکروں نے اپنے دل میں بیچ نادانی کی ضد پھر اتارا اللہ نے اپنی طرف کا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر۔ یہ لفظ صرف مدنی سورتوں میں پایا جاتا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے اس خیال کو یہودیوں سے اخذ کیا ہے۔

دیکھو Geiger's Judaism and Islam صفحہ ۳۹۔

کے سر کردہ اشخاص اور سرداروں کو بیدریغ بڑے بڑے قیمتی تحائف اور نذرانے عنایت کئے۔ جس پر آپ کے پرانے مومنین رنجیدہ خاطر ہو کر کڑکڑانے لگے۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ کہ کچھ مدت بعد اس ذراسی بات کے لئے بھی وحی نازل ہوا چنانچہ سورہ توبہ کے ۷ رکوع آیت ۵۸تا۵۹ میں مندرج ہے۔ **وَمِنْهُم مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ فَإِنْ أُعْطُواْ مِنْهَا رَضُواْ وَإِن لَّمْ يُعْطَوْاْ مِنهَا إِذَا هُمْ يَسْخَطُونَ وَلَوْ أَنَّهُمْ رَضُواْ مَا آتَاهُمُ اللّهُ وَرَسُولُهُ وَقَالُواْ حَسْبُنَا اللّهُ سَيُؤْتِينَا اللّهُ مِن فَضْلِهِ وَرَسُولُهُ إِنَّا إِلَى اللّهِ رَاغِبُونَ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاء وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ**[155] **قُلُوبُهُمْ** یعنی اور بعض ان میں ہیں کہ کچھ تجھ کو طعنہ دیتے ہیں زکواۃ بانٹنے میں سو اگر اُن کو ملے اس میں سے تو راضی ہوں اور اگر ان کو نہ ملے تب ہی وہ ناخوش ہو جاویں اور کیا خوب تھا اگر وہ راضی ہوتے جو دیا ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے اور کہتے بس ہے ہم کو اللہ۔ دے رہیگا ہم کو اللہ اپنے فضل سے اور اس کا رسول۔ ہم کو اللہ ہی چاہئے زکواۃ جو ہے سو حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور اس کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا ہے۔

جو قوموں کے سرداروں اور سر گروہوں کو خیرات کے نام سے بڑے بڑے قیمتی تحفے اور نذرانے دئے گئے۔ وہ فی الحقیقت ایک طرح کی رشوت تھی اور مدنی مسلمانوں کا اس قسم کی کارروائی پر اعتراض کرنا کچھ تعجب کی بات نہ تھی۔ **وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ** کو مفسرین اب منسوخ[156] شدہ بیان کرتے ہیں کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق نے نو مسلموں کو اس قسم کے تحائف وہدیہ کا دینا بند کر دیا تھا۔ اور بند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اب چونکہ خُدا نے اسلام کو بہت کچھ ترقی اور قوت وغلبہ عطا فرمایا تھا اس لئے اسی طرح نذرانے دینے اور لالچ دلانے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔

۹ ہجری سال رسالت یا وکالت کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس وقت مکہ وکعبہ پر آنحضرت قابض تھے۔ آپ کی شہرت بدرجہ کمال پھیل گئی تھی۔ اور بہت سی قومیں یکے بعد دیگر آپکی مطیع وفرمانبردار ہو گئیں اور اپنی اطاعت وفرمانبرداری کے اظہار واقرار کے لئے انہوں نے آنحضرت کی خدمت میں اپنے قاصد اور وکیل بھیجے۔

مورخ ابنِ اسحاق لوگوں کے اس طرح مطیع (فرمانبردار) ہونے اور اسلام قبول کرنیکی اخلاقی حقیقت یوں بیان کرتا ہے کہ جب مکہ فتح ہو گیا۔ اور قریش نے اسلام سے مغلوب ہو کر اطاعت (تابعداری) قبول کر لی تو باشندگان عرب نے یہ جانکر کہ ہمیں حضرت محمد کے مقابلہ کی تاب نہیں اور لڑائی میں ہم اس سے عہدہ برا (جیتنا) نہیں ہو سکتے دین اسلام قبول کر لیا۔ جنگی افسروں کے ماتحت افواج اسلام نے ملک کو لوٹ مار کر صاف کر دیا اور منکرین اسلام کے لئے خانہ کعبہ کی زیارت کی قطعی ممانعت (روک۔ بندش) ہو گئی۔ چنانچہ سورہ توبہ کی ۵ ویں آیت میں یوں مرقوم ہے۔ **فَإِذَا انسَلَخَ الأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُواْ الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُواْ لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِن تَابُواْ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ وَآتَوُاْ الزَّكَاةَ فَخَلُّواْ سَبِيلَهُمْ**۔ یعنی پھر جب گذر جاویں مہینے پناہ کے تو مار مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو اور گھیر اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں۔ پھر اگر وہ توبہ کریں اور کھڑی رکھیں نماز اور دیا کریں زکواۃ تو چھوڑ دو ان کی راہ۔

---

[155] **وَالْمُؤَلَّفَةِ** القلوب کے تمام مفسرین بالاتفاق یہی بیان کرتے ہیں کہ اس سے وہ لوگ مراد تھے جنہوں نے آبائی دین ومذہب سے تالیف قلبی کے باعث چھوڑ کر اسلام قبول کیا اور خصوصاً جو سردار ورئیس مختلف اقوام سے مشرف باسلام ہوتے تھے انہی پر اس جملہ کا اطلاق ہوتا تھا۔

[156] ان تحائف وہدایت کی تنسیخ ومقاط کے باب میں مفسر حسین فرماتے ہیں کہ بعد از ظہور اسلام وغلبہ مسلمانان باجماع صحابہ ساقط شدہ است۔ (تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ ۲۶۰) پھر خلاصۃ التفاسیر جلد دوم کے ۲۷۱ صفحہ پر یوں مرقوم ہے کہ زمانہ ابو بکر صدیق باجماع حصّہ مولفۃ القلوب ساقط ہو گیا اس لئے کہ ضرورت تالیف قلوب کر نیکی باقی نہ رہی۔

کہتے ہیں کہ اس مشہور و معروف آیت نے جو کہ آیت السیف یا تلوار کے نام سے نامزد ہے۔ان تمام قیود[157] کو جو مسلمانوں کو لڑائی شروع کرنے سے روکتی اور مانع تھیں۔توڑ ڈالو نہ صرف یہ بلکہ سورہ عنکبوت کے رکوع ۵ کی دوسری آیت میں جو نرمی کے الفاظ مندرج ہیں کہ **وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ** یعنی جھگڑا نہ کرو کتاب والوں سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو ان کو بھی منسوخ کر دیا۔

بہر حال اب اہلِ عرب پر روشن ہو گیا کہ آنحضرت کی آئندہ کسی طرح سے مخالفت کرنا بالکل بے سود اور لاحاصل (بے فائدہ) ہے۔ان کے جتھے میں تفرقہ پڑ گیا اور اس کی جمعیت (اکٹھ) نہایت ضروری تھی پر اس قسم کے کام کو انجام دینا صرف حضرت محمد ہی کا کام تھا۔اس طرح اسلامی جنبش نے قومی ترقی کی صورت اختیار کی اور وہی شخص جو مدت مدید (بہت عرصہ) تک نزاع و فساد (لڑائی جھگڑا) اور جنگ و جدل کا باعث تھا۔اب تمام عرب کا پیشوا اور مختار و حاکم تسلیم کیا گیا۔اس طور پر آنحضرت کی پہلی آرزوئیں اور خواہشیں پوری ہو گئیں۔

جو شخص ملکی معاملات میں آپ کی اطاعت قبول کرتا تھا۔اس کے لئے اسلام کا قبول کرنا بھی ضروری تھا اور اس کی ایک ہدایت لابدی (یقینی) شرط یہ تھی کہ اس کو نہ صرف اسلام کی تعلیم اور اس کے اخلاقی مسائل کو تسلیم کرنا پڑتا تھا۔بلکہ اس پر ہر امر میں اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری بلا حجت اور بے چون وچرا (کسی عُذر کے بغیر) فرض و واجب تھی۔علاوہ بریں ہر سال اسے اپنی جائیداد کا دسواں حصّہ دینا پڑتا تھا اور یہ کسی طرح کا خراج یا جزیہ نہ تھا بلکہ دینی سخاوت تھی۔جس سے اس کی باقی جائداد و دولت کا پاک ہونا خیال کیا جاتا تھا اور اس میں آنحضرت کی خیرات واخراجات اور سلطنت[158] کی ترقی ملحوظ (خیال کیا گیا) ہوتی تھی۔

کچھ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ۶۳۰ء میں آنحضرت کو یہ خبر ملی۔کہ بادشاہ ہیرقل چھوٹے چھوٹے راجاؤں اور جاگیرداروں کو فراہم کر کے اس خیال اور ارادہ سے بے شمار فوج جمع کر رہا ہے۔کہ مسلمانوں کے حملوں اور یورشوں (فساد) کو آئندہ کے لئے بند کرے یا عرب پر حملہ کر کے اسے تاخت وتاراج (برباد کرنا) کر لے۔اس پر آپ نے ایک مسلح فوج ملک سیریا (شام) کی حدود کی طرف بھیجی۔آنحضرت کو یہ معاملہ نہایت نازک معلوم ہوا اور یونانی سلطنت روم اس کے مددگاروں کے مقابلہ کی خاطر محمدی فوج اتنی جمع ہوئی۔کہ اس سے پیشتر کبھی اس قدر مومنین آنحضرت کے جھنڈے تلے لڑنے مرنے کو تیار نہ ہوئے تھے۔جب بہت سی تکالیف و مصائب کے بعد یہ لشکر تبوک[159] پہنچا تو معلوم ہوا کہ رومی لشکر کشی کی خبر میں بہت مبالغہ (بڑھا چڑھا کر بتانا) کیا گیا تھا۔بادشاہ اپنے ارادہ کو فسخ (منسوخ کرنا) کر کے وہاں سے چلا گیا تھا۔اب حضرت محمد یہود و نصاریٰ کی مختلف ریاستوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ایلا کا عیسائی حاکم یوحنا آنحضرت سے عہد و پیمان کر کے آپکا باجگزار (ریاست کو محصول دینے والا) بن گیا۔بعض یہودی اقوام نے بھی آپکی اطاعت اختیار کر لی۔اور باقاعدہ جزیہ (غیر مسلم پر سالانہ محصول) ادا کرنیکا اقرار کیا اور ۶۳۰ء کے اختتام پر آنحضرت اس آخری یورش (حملہ) سے مدینہ میں واپس آئے۔

یہود و نصاریٰ پر اس جبر و تعدی (زبردستی) کے جواز (اجازت) کا بیان سورہ توبہ کی ان چند آیات میں پایا جاتا ہے جو نہایت معتبر مفسرین کے نزدیک عین یورش تبوک کے بعد ہی نازل ہوئی تھیں۔چنانچہ ۲۹ آیت سے ۳۵ آیت سے یوں مندرج ہے۔ **قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ**

---

[157] ان قیود کا بیان سورہ بقرہ کے ۲۴ رکوع میں یوں مندرج ہے **وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا** یعنی لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو لڑتے ہیں تم سے اور زیادتی مت کرو۔یہ حکم جس کے مطابق مسلمانوں کو صرف اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے ہی لڑنا جائز تھا آیت السیف سے منسوخ ہو گیا چنانچہ تفسیر حسینی جلد اوّل کے ۳۲ صفحہ میں مندرج ہے کہ ایں حاکم بآیت سیف منسوخ است پس اب اپنی حفاظت و بچاؤ کے لئے لڑنا ایک پرانی کہانی متصور ہونے لگی اور تمام مشرکین سے دائمی لڑائی کی تعلیم مومنین کے دلوں میں نقش ہو گئی۔

[158] Muir's Life of Muhammad جلد چہارم صفحہ ۱۷۰۔

[159] تبوک ایک مقام کا نام ہے جو مدینہ اور دمشق کے درمیان مساوی فاصلہ پر واقع ہے۔

**الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَرَسُولُهُ وَلاَ يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُواْ الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُواْ الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللهِ وَقَالَتْ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللهِ ذَلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِؤُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُواْ مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ[160] اللهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ اتَّخَذُواْ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُواْ إِلاَّ لِيَعْبُدُواْ إِلَـهًا وَاحِدًا لاَّ إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ يُرِيدُونَ أَن يُطْفِؤُواْ نُورَ اللهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللهُ إِلاَّ أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللهِ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلاَ يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ۔** یعنی لڑوان لوگوں سے جو یقین نہیں رکھتے اللہ پر نہ پچھلے دن پر۔ نہ حرام جانیں جو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسول نے۔ اور نہ قبول کریں دین سچا۔ وہ جو کتاب والے ہیں جب تک دیویں جزیہ سب ایک ہاتھ سے اور وہ بے قدر ہوں۔ اور یہود نے کہا عزیر بیٹا اللہ کا اور نصاریٰ نے کہا مسیح بیٹا اللہ کا۔ یہ باتیں کہتے ہیں اپنے منہ سے۔ ریس کرنے لگے اگلے منکروں کی بات کی۔ مار ڈالے انکو اللہ کہاں سے پھرے جاتے ہیں۔ ٹھہراتے ہیں اپنے عالم اور درویشوں کو خُدا[161] اللہ کو چھوڑ کر اور مسیح مریم کے بیٹے کو اور حکم یہی ہوا تھا کہ بندگی کریں ایک خُدا کی کسی کی بندگی نہیں اس کے سوائے وہ پاک ہے

---

[160] قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ (خُدا ان کو ہلاک کرے یا مار ڈالے) سورہ مائدہ کے لائم ونرم الفاظ کے بالکل برعکس ہے چنانچہ سورہ مائدہ کے ۱۱ رکوع میں یوں لکھا ہے کہ وَ لَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَ رُهْبَانًا وَّ اَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ یعنی اور تو پاویگا سب سے نزدیک محبت میں مسلمانوں کے وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس واسطے کہ ان میں عالم ہیں اور درویش ہیں اور یہ کہ وہ تکبر نہیں کرتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رہے کہ اس آیت کے بعد کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسیحی لوگ اسلام قبول کرنے کو تیار تھے۔ چنانچہ یوں لکھا ہے کہ وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ یعنی اور جب سنیں جو اترا رسول پر تو دیکھے ان کی آنکھیں ابلتی ہیں آنسوؤں سے اس پر جو پہچانی بات حق کہتے ہیں اے رب ہم نے یقین کیا کہ سو تو لکھ ہم کو ماننے والوں کے ساتھ۔ بہر کیف متذکرہ وبالا دونو آیات میں مسلمانو کے مسیحیوں سے عام رشتہ کا ذکر نہیں ہے بلکہ ان سے ایک خاص محدود تعلق ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ اس کے ان آیات سے آنحضرت کے خیالات کچھ متین اور آخری معلوم نہیں ہوتے کیونکہ اگرچہ یہ آیتیں سب سے آخری سورۃ میں مندرج ہیں تاہم ان کا واسطہ بہت پہلے زمانہ سے ہے۔ اس کے ثبوت میں ہم مفسر حسین کا بیان پیش کرتے ہیں وہ کہتا ہے کہ یہ آیات ان ستر آدمیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جن کو حبش کے بادشاہ یعنی نجاشی نے آنحضرت کے پاس بھیجا۔ اور جس نے قریباً ۷ ہجری میں ان لوگوں پر جو مکہ سے بھاگ کر اس کے پاس پناہگزین ہوئے تھے بڑی مہربانی ظاہر کی تھی۔ پس اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ عیسائی اس آخری وقت نہیں آئے تو تو بھی یہ اس وقت سے دو سال پیشتر کا ذکر ہے جب سورہ مائدہ میں سخت حکم آیا کہ مسلمان یہود ونصاریٰ کے ساتھ دوستی نہ رکھیں۔ چنانچہ اس مضمون پر یہ آخری حکم سورہ مائدہ کے آٹھویں رکوع کی پہلی آیت میں یوں مندرج ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اے ایمان والو مت پکڑو یہود ونصاریٰ کو رفیق۔ وہی آپس میں رفیق ہیں. ایک دوسرے کے اور جو کوئی تم میں رفاقت کرے وہ انہی میں ہے۔ حسین بیان کرتا ہے کہ ان مسیحی زایروں کو آنحضرت نے سورہ یس سنائی جو خوش ہو کر ایک دوسرے کہنے لگے کہ جو کچھ عیسیٰ پر نازل ہوا تھا اس سے قرآن بہت مشابہت رکھتا ہے پھر انہوں نے اسلام قبول کر لیا چنانچہ تفسیر حسینی جلد اوّل کے ۱۵۵ صفحہ پر یوں مرقوم ہے کہ احکام اسلام وایمان کردہ بایکدیگر گفتند کہ قرآن چہ مشابہت تمام دار بآنچہ بر عیسیٰ نازل شدہ۔

[161] اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا ترجمہ مفسر حسین یوں کرتے ہیں کہ فرا گرفتند یہودی نصاریٰ علمائے خور داو عباد خود اخدایان۔ لفظ ارباب رب کی جمع ہے اور لفظ ربی کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کو یہود ونصاریٰ اپنے کاہنوں اور معلموں کے حق میں استعمال کرتے تھے لیکن عربی زبان میں صرف خُدا کے حق میں یہ لفظ استعمال کر سکتے تھے (دیکھو راڈویل صاحب کا قرآن صفحہ ۶۱۶ اور پامر صاحب کا قرآن جلد اوّل صفحہ ۱۷۷) جب کوئی یہودی کسی عالم کو ربی کہتا تھا تو اس میں کسی طرح کا کوئی گناہ مقصود نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس لفظ کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ اس کو خُدا جانتا تھا۔ حضرت محمد نے غلطی کھائی اور اس لفظ کے غلط معنی لے لئے۔ اس غلطی کا یہ سبب بیان کیا جاتا ہے کہ آپ عبرانی زبان سے بے بہرہ تھے لیکن ایک اور مشکل پیش آتی ہے کہ یہ امر الہامی تعلیم کے بر خلاف ہے کیونکہ آنحضرت کا یہ دعویٰ تھا کہ قرآن آپکا کلام نہ تھا بلکہ خُدا کا کلام جو آپ کے وسیلہ بولتا تھا اس آیت سے قرآن کا وحی کی معرفت نازل ہونا صاف اڑ جاتا ہے اور محض غلط ثابت ہوتا ہے۔

ان کے شریک بتانے سے۔ چاہیں کہ بجھادیں روشنی[162] اللہ کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے بن پوری کئے اپنی روشنی اور پڑے برا مانیں منکر۔ اسی نے بھیجا اپنا رسول ہدایت لیکر اور دین سچا تا اس کو اوپر کرے[163] ہر دین سے اور پڑے برا مانیں مشرک۔ اے ایمان والو بہت عالم اور درویش اہل کتاب کے کھاتے ہیں مال لوگوں کے ناحق اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے۔ اور جو لوگ گاڑ رکھتے ہیں سونا اور روپیہ اور خرچ نہیں کرتے اللہ کی راہ میں۔ سو ان کو خوشخبری سنا دکھ والی مار کی جس دن آگ دہکاوینگے اس پر دوزخ کی پھر داغینگے اس سے ان کے ماتھے اور کروٹیں اور پیٹھیں[164]۔

یہ آیتیں جو کہ آنحضرت کی آخری جنگی مہم سے علاقہ (تعلق) رکھتی ہیں۔ جس میں آپ کا مقصد اعلیٰ یہ تھا کہ یہود و نصاریٰ کو مطیع و تابعدار بنادیں۔ ان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے یہود و نصاریٰ اور ان کے عقائد کی نسبت اب بہت اچھی طرح سوچ سمجھ لیا تھا کہ آئندہ ان سے اسلام کا کیا رشتہ ہوگا۔

جن آیات کے ابھی حوالے دئے گئے ہیں ان کے مطابق اور اسی مضمون کی ایک آیت سورہ مائدہ میں بھی پائی جاتی ہے۔ پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بعد میں یہاں داخل کی گئی ہے۔ اور اس کے نزول کے باب میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ عین جنگ احد کے بعد نازل ہوئی تھی۔ اگر یہ بات یوں ہے تو اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سورہ توبہ میں جو کچھ یہود و نصاریٰ کے متعلق آخری فرمان جاری ہوا وہ کسی طرح کے خاص اسباب کی وجہ سے جلد بازی اور ناعاقبت اندیشی کا خیال نہ تھا۔ بلکہ کئی سال پیشتر کے ایک فصیل (دیوار) شدہ قانون وضابطہ کی تکمیل کا اظہار تھا۔ چنانچہ سورہ مائدہ کے رکوع ۸ کی پہلی آیت میں یوں مرقوم ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى اوّلِيَاء بَعْضُهُمْ اوّلِيَاء بَعْضٍ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللّهَ لاَ**

---

[162] اس روشنی سے اسلام۔ قرآن یا حضرت محمد کی نبوت یا خُدا کی پاکیزگی و تقدس (حجت روشن بر تقدس تنزہ او زارین) کی صاف دلیل مراد ہے بافو اھم سے مجازی اصطلاحی طور پر یہود و نصاریٰ کی درغگوئی مراد ہے جس سے وہ سچے دین کو پھیلنے سے روکتے ہیں اور اسکی اشاعت کے مانع ہوتے ہیں۔

[163] اسکی یوں تفسیر کرتے ہیں کہ خُدا نے حضرت محمد کو اسلام یعنی سچے دین کے ساتھ بھیجا ہے اور یہ کہ اسلام تمام دیگر ادیان پر غالب آکر انکی شریعت واحکام کو منسوخ کردیگا اور عیسیٰ کی دوسری آمد کے تمام جہان سوائے اسلام کے کوئی دوسرا دین نہیں ہوگا۔ چنانچہ تفسیر حسینی جلد اوّل کے صفحہ ۲۵۳ اور ۲۵۴ میں یوں مندرج ہے غالب گرداند دین خوادر برہمہ دینا منسوخ ساز واحکام آنرا وآن بعد انزول عیسیٰ خواہد بود کہ بروئے زمین جز دین اسلام نماند۔ پھر خلاصۃ التفاسیر جلد دوم کے ۲۴۳ صفحہ پر یوں مرقوم ہے کہ اسلام ناسخ الادیان وغالب البرہان است۔

[164] یہ تمام بیان نہایت ہی قابل غور اور توجہ کے لائق ہیں لہذا ہم اسی مقام پر اس کی نسبت مفسر حسین کا بیان درج کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ اے بشیدا ے مومناں وکارزا کنید بآنکہ ایمان ندارند بخُدا یعنی یہود کہبہ تثلیہ قائل اند وانصاریٰ کی تثلیث رامتعقد اندئے گروند بروز قیامت یہود گویند کہ در بہشت اکل وشرب نخواہد بوانصاریٰ معادر روحانی راثبات میکیند ومحرم نمیدانند ونمیدارند آنچہ حرام کردہ است خُدا از حمر وود ختر آنچہ ثابت شدہ است وبیان الذین لایو منون میفرماید کہ باہل کتاب مقاتلہ کنند تاقتیکہ بدہند جزیہ وحال آنکہ ایشاں خور شدگان باشند یعنی جزیہ بدست آرند ونشینند تاوقتیکہ تسلیم کنند یاازیشاں جزیہ گیرند وگردن ایشاں رابسیلی فروکوبند۔ پس اب یہ امر نیم روز کی طرح روشن ہے کہ اس آیت میں عرب کے بُت پرستوں کا ذکر نہیں ہے بالکل صاف یہود ونصاریٰ کی طرف اشارہ ہے۔ اس آیت سے اور خصوصاً اس کے الفاظ ہمہ ماغرون کے باعث محمد ممالک میں ضمی یعنی جزیہ دینے والوں سے بڑی بدسلوکی ہوتی تھی اس امر میں بہت مختلف رائیں ہیں جزیہ کن سے لینا چاہیے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ صرف یہود ونصاریٰ ہی سے جزیہ لینا چاہئے امام اعظم کا قول ہے کہ تمام مشرکین سے جزیہ لینا چاہئے سوائے عربی بُت پرستوں کے جن کے سامنے یا تیع است یا اسلامہ کو پیش کیا جائے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ جو لوگ اسلام سے منحرف اور برگشتہ ہو جاویں ان کو قتل کرنا چاہئے اور ان کے سواسب سے جزیہ لینا روا ہے۔ اس میں قرآن اور سنت کی مساوی الوزن فوقیت وفضیلت کو قائم رکھا گیا ہے اور بہشت کی اصلیت ماہیت کا بیان کیا گیا ہے۔ عزیر کی نسبت مفسر حسین ایک روایت یوں بیان کرتے ہیں کہ نبوکدنصر بادشاہ نے توریت کے تمام نسخے ضائع کردیئے لیکن عزیر نے تمام توریت حفظ کی ہوئی تھی وہ بابل کی اسیری سے واپس آکر مرگیا اور پھر سو سال دوبارہ زندہ ہو کر اس نے تمام توریت لکھوائی یہودی اس پر تعجب کرکے کہنے لگے کہ اس کا باعث یہ ہے کہ عزیر خُدا کا بیٹا ہے۔ یہودیوں میں اس روایت کا کہیں نام ونشان بھی نہیں پایا جاتا اور آنحضرت کا یہود پر الزام لگانا محض اختراع اور بناوٹ ہے۔ اس مذکورہ بالا روایت کی طرف سورہ بقرہ کے 35 رکوع میں بھی ارشاد پایا جاتا ہے کہ چنانچہ لکھا ہے کہ **أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىَ يُحْيِي هَـَذِهِ اللّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللّهُ مِئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِئَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى العِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا** یعنی جیسے وہ شخص زرا ایک شہر پر اور وہ گرپڑا تھا اپنی چھتوں پر بولا کہاں جلاویگا۔ اس کو اللہ مرگئے پیچھے پھر مار کھ اللہ نے اس شخص کو سو برس پھر کہا تو کتنی دیر رہا۔ بولا میں رہا ایک دن یا دن سے کچھ کم کہا نہیں بلکہ تو رہا سو برس اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا سڑ نہیں گیا دیکھ اپنے گدھے کو اور تجھ کو ہم نمونہ کیا چاہیں لوگوں کے واسطے اور دیکھ ہڈیاں کس طرح ان کو ابھارتے ہیں پھر ان پر پہناتے ہیں گوشت مفسرین نے اس آیت کو عزیر کی طرف منسوب کرکے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ شہر یروشلم کے کھنڈرات کے پاس سے گذرا اس کے پھر تعمیر ہونے میں اس کے دل میں شکوک پیدا ہوئے یعنی وہ خیال کرنے لگا کہ خُدا اس کو پھر کبھی تعمیر نہیں کریگا پھر خُدا نے اسکو یہ معجزہ دکھلایا تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ ۵۰ حضرت محمد اس معاملہ میں عزرا اور نحمیاہ میں امتیاز نہیں کرسکے۔ غالباً اس کہانی کی بنیاد یہ معلوم ہوتی ہے کہ آنحضرت کو کسی نے نحمیاہ کے سوار ہو کر یروشلم کے کھنڈرات کے گرد پھرنیکا کا خیال غیر صحیح طور پر سنایا ہوگا۔ دیکھو نحمیاہ کی کتاب اس کا دوسرا باب ۱۱ آیت سے ۱۶ آیت تک۔

**يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ**۔یعنی اے ایمان والو مت پکڑو یہود[165] ونصاریٰ کو رفیق وہی آپس میں رفیق ہیں ایک دوسرے کے اور جو کوئی تم میں ان سے رفاقت کرے وہ انہیں[166] میں ہے۔اللہ راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو۔

اس طرح سے اب حضرت محمد ﷺ نے یہود و نصاریٰ سے تعلق قطع کر لیا۔اپنی مرسلانہ (رسالت) زندگی کے آغاز میں آپ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔اور ان کی مقدس کتابوں کا بڑے ادب ولحاظ سے ذکر کیا کرتے تھے۔اور آپ کی تعلیم میں جس قدر اچھی باتیں ہوتی تھیں وہ سب کی سب انہی کی تعلیم سے اُڑائی ہوئی ہوا کرتی تھیں۔اب جس وقت آپ کی طاقت سب پر فوق (برتری) لے گئی۔تو آپ نے اپنی مدد و یاری کے تمام پرانے وسائل کو یکطرفہ رد کر دیا اور سب کو اپنے تابع فرمان بنایا۔

اگرچہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں صرف وہی وسائل[167] وطریقے کام میں لائے گئے ہیں۔جن سے محض صلح وسلامتی متصور تھی۔تاہم اس کا تسلیم کرنا اور اس بیان کی صداقت (سچائی) کے معتقد (اعتقاد) ہونا محال (مشکل) ہے۔اس قدر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ بعض اوقات ایسا ہی ہوا اور نیز یہ کہ دینِ عیسوی کے بعض مسائل کی بالجبر تلقین کی گئی لیکن ہمارا اعتراض یہ ہے۔کہ جبر و تعدی (زبردستی) مسیحیت کے بانی کی ذات پاک اور اس کی تعلیم کے بالکل برخلاف و برعکس ہے۔البتہ حضرت محمد کی ذات اور اسکے افعال (کام) سے اسکی بہت مطابقت ہے۔آنحضرت کے مومنین کے لئے آپ کے آخری الفاظ بالکل صاف ہیں۔جب تک صفحہ ہستی پر اسلام کا نام ونشان باقی ہے ہر ایک پکے مسلمان کے کانوں میں یہی آواز گونجتی رہیگی

---

165 تفسیر حسینی جلد اوّل کے ۱۴۹ صفحہ پر مرقوم ہے کہ ایں سخن غایت تہدید است در مولات یہود و نصاریٰ۔

166 ساتور کوع میں کسی قدر ظاہری آزادی کا خیال پایا جاتا ہے کہ لیکن یہ آیت اس کی نقیض معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس سخت حکم کے برعکس ساتویں رکوع میں یو مندرج ہے کہ ہر ایک کو تم میں دیا ہم نے ایک دستور اور راہ اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک دین پر کرتا لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہے اپنے دئے حکم میں۔تفسیر حسینی جلد اوّل کے ۱۴۸ صفحہ میں اس کا بیان یوں ہے کہ آزید اشمار آنچہ شمار دادہ است از شرائع مختلفہ مناسب ہر عضوے وزمانے تا مطیع از عاصی ممتیز شود۔ان دونوں آیات سے مفسرین نہایت مشکل میں پڑ گئے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مذاہب مختلفہ کا بانی اور قائم کرنے والا خُدا ہی ہے درحالیکہ عبارت متن سے یہ امید بلکہ یقین ہونا چاہیے کہ مختلف مذاہب کی ہستی انسان کے گناہ اور اس کی خود پسندی خودرائی کا نتیجہ ہے حامیان اسلام میں سے پکے یعنی سنی مفسرین لکل کے بیان میں فرماتے ہیں کہ اسکا مفہوم ہر ایک فرد بشر یا ہر ایک زمانہ یا قوم نہیں ہے بلکہ اسے ہر ایک نبی مراد ہے جس کو شریعت ملی اور اسی طرح سے اس ہماری عبارت کا مطلب یہ ہے کہ خُدا نے ہر ایک نبی کو شریعت دی اور اسکی تعمیل وتابعداری اس زمانہ کے لوگوں پر اس وقت تک فرض تھی جب تک کہ وہ شریعت منسوخ نہ ہو جاوے چنانچہ اسی طرح تمام نبی اور دین ایک دوسرے کے بعد خُدا کی طرف سے مقرر ہوتے رہے اور اب یہود و نصاریٰ اپنی اپنی شریعتوں کی تعمیل نہیں کر سکتے کیونکہ اس زمانہ میں ان کی شریعتیں ان کے دینوں سمیت منسوخ ہو گئیں اور اب صرف اسلام ہی کی اطاعت وتابعداری فرض ہے (دیکھو خلاصتہ التفاسیر جلد اوّل صفحہ ۵۳۰) عبداللہ ابن عباس لکل کا مفہوم لکل نبی منکم یعنی ہر ایک نبی بتاتے ہیں اور شاہ ولی اللہ محدث اس کا ترجمہ ہر گروہ بیان کرتے ہیں۔

167 اس مقام پر آیات قرآنی اقتباس نہیں کی گئی۔سورہ بقر میں جو آیات اس امر کے متعلق ہیں ممکن ہے کہ ان کا حوالہ ۷ ہجری کے حج سے علاقہ رکھتا ہوا گر یوں ہو تو یہ آئتیں بعد میں سورہ بقرہ میں درج کی گئی ہیں۔پھر اگر یہ سچ ہے تو اس سے صرف آنحضرت کے مکی مخالفین کی طرف اشارہ ہے لیکن سورہ بقرہ کے ۲۴ رکوع میں ان کی نسبت یوں مرقوم ہے کہ اور لڑو ان سے جب تک باقی نہ رہے اور حکم رہے اللہ کا۔ذرا خیال کرنا چاہئے کہ فعل قتل ہے نہ جھڑکنا اسکے معنی بجائے قتل کرنے یا مارنے کے جہد و کوشش ہو سکھیں۔(دیکھو Sell's Faith of Islam صفحہ ۳۶۴) تمام دلائل جنگی بنیاد یہ ہے کہ قرآن میں جھڑکنے کے معنی لڑائی کرنا نہیں بلکہ سرگرمی سے کوشش کرنا ہیں اس قسم کی آیات پر مطلق عائد نہیں ہوتے اور نہ ان سے اس حکم کی سختی اور خشونت میں کسی طرح کا فرق آتا ہے۔اگر یہ آیت محض اہل مکہ کے حق میں نازل ہوئی ہو تو تو بھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں اشاعت اسلام تلوار ہی سے ہوئی تھی اور تلوار ہی سے ہوئی نہ کہ صلح وامن کے وسائل سے جس لڑائی کا اوپر بیان ہوا ہے یہ محض موجودہ طرز حکومت کے برخلاف ملکی لڑائی ہی نہ تھی بلکہ اہل مکہ سے یہ آپ کی دینی لڑائی تھی۔ساکنان مکہ آپ کو مدنی حاکم کی حیثیت میں نہ اپنا ملکی حاکم مانتے تھے اور نہ دینی پیشوا قبول کرتے تھے۔اس عبارت کی یہ سب سے ملائم تفسیر ہے لیکن بہت سے مسلمان اس کو اس قدر محدود نہیں کرتے۔ان کو جہاد کی آواز ہر زمانہ میں صاف سنائی دیتی ہے۔الجهاد ماضی الی یوم القیامة کی حدیث کو بسا اوقات بڑی خوشی سے اقتباس کرتے ہیں۔یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت جزیہ دینے والوں اور لوگوں کے سوائے جو مومنین سے رابطہ اتحاد اور عہد و پیمان رکھتے ہوں سب پر محیط ہے لیکن تمام جزیرہ نمائے عرب میں کسی کافر کو رہنے کی اجازت نہ تھی اور ہر ایک مرتد کے لئے قتل کا حکم نافذ ہو چکا تھا۔(دیکھو خلاصتہ التفاسیر جلد اوّل صفحہ ۱۳۲) لہذا ان آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ خواہ محدود طور پر سمجھا جاوے یا وہ غیر محدود طور پر عائد ہوں ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اشاعت اسلام میں جن طریقوں اور تدابیر کو استعمال کیا گیا وہ صلح وسلامتی سے خالی اور محض جبر کے نام نامی کے لائق ہیں۔

کہ **قاتلھم اللہ** یعنی خُدا ان کو قتل کرے۔ آنحضرت نے اپنے مومنین کو صلح وسلامتی کا ایک حرف بھی میراث میں نہ دیا بلکہ ان میں کشت وخون [168]**(خون ریزی)** کی ایسی پھونک مار گئے کہ اس سے انکے دلوں میں مذہبی دیوانگی کی روح ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

فی الحقیقت نہایت افسوس کی بات ہے۔ کہ ایسے نامور شخص کی زندگی کا ایسا انجام ہو۔ مسلمانوں پر جہاد کا فرض ہونا رفتہ رفتہ قرار پایا۔ اور اس بات کا تصور میں آنا کہ صرف اللہ ہی کا دین ہو۔ اور اسلام ہی سب پر غالب رہے نہایت اعلیٰ خیال تھا۔ اور جس قدر آنحضرت کی ملکی طاقت بڑھتی گئی اسی قدر آپ کے دل میں یہ خیال زیادہ صفائی سے نقش ہوتا گیا۔ ایام مکہ کے آخر میں جو آپ کے خیالات تھے اب وہ بالکل جاتے رہے۔ اس وقت آپ نے مومنین کو یوں فرمایا تھا۔ **وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ**۔ یعنی جھگڑا نہ کرو کتاب والوں سے مگر اس طرح پر جو بہتر ہو (سورہ عنکبوت ۴۵ آیت)۔

اس سے سات آٹھ سال پیشتر جب مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ گئے۔ اور یہود ونصاریٰ اور بُت پرست عربی اقوام سے سابقہ پڑا اس وقت آنحضرت نے مسلمانوں کو ایک نہایت عمدہ نصیحت کی اور فرمایا کہ لا اکراہ فی الدین یعنی زور نہیں دین کی بات میں (دیکھو سورہ بقرہ ۳۴ رکوع) لیکن اب آپ اس کو بھی فراموش کر بیٹھے۔

اس وقت آنحضرت کا اور ہی ڈھنگ تھا۔ بدرجہ کمال زبردستی ہونے لگی جس کو عمل میں لانا اور اسکی تعلیم دینا صرف کسی فتح مند اور صاحبِ اقتدار شخص کا کام ہے۔ جب آپ کو یہ رُتبہ حاصل نہ تھا اس وقت آپ ایک بھگوڑے واعظ کی حیثیت میں اس پر قادر نہ تھے [169]لیکن اب تو مدت سے فتح مندی کے نشہ نے آپکی ضمیر کی آنکھوں میں خاک ڈال کر اسے جلاوطن کر چھوڑا تھا۔ اب آنحضرت قبر میں پاؤں لٹکائے ہوئے تھے۔ اور چلتے چلتے اپنے مومنین کو تمام جہان سے لڑنے اور قتال (قتل) کرنے کا حکم ورثہ میں دے گئے۔ خواہ مخواہ ایک اور دینی پیشوا کا آنحضرت سے مقابلہ کرنا پڑتا[170] ہے۔ جس نے اپنے شاگردوں کو یوں فرمایا کہ تمام قوموں میں صُلح کی انجیل (خوشخبری) کی منادی کرو۔ ماسوائے اس کے دونوں کے فرمان کی تعمیل بھی نہایت سرگرمی اور عجیب طور سے کی گئی۔ اہلِ عرب ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لیکر شہر جو جلاتے اور وہاں کے مظلوم باشندوں میں اسلام کی اشاعت بزور شمشیر کرتے تھے۔ لیکن مسیح کے رسول رومی سلطنت کی اخلاقی تاریکی میں نہایت حلم اور عدیم المثال (جس کے برابر کوئی نہ ہو) نور ہدایت کی طاقت سے شائستگی کی بنیاد رکھتے۔ اور قومی اور خانگی (گھریلو) زندگی کے ناپاک سوتوں اور سرچشموں کو پاک وصاف کرتے تھے۔

---

[168] سب سے آخر جو اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ اشاعت اسلام کو جبر وتعدی سے بری کیا جاوے اور ظاہر ہو کہ اسلام صلح وامن سے پھیلا وہ J.W.Arnold صاحب کی کتاب The Preaching of Islam میں پائی جاتی ہے اس میں مصنف موصوف نے غلطی کھائی ہے تاہم یہ کتاب دلچسپ ہے مصنف کو جس قدر قرآن سے نرم وملائم الفاظ کے فقرات ملے ہیں اس نے اس کتاب میں تیسرے صفحہ سے چھٹے صفحہ تک شروع میں درج کئے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ اگرچہ اس نے اسی سورۃ یعنی سورہ توبہ سے کئی آیات اقتباس کی ہیں تو بھی وہ ۲۹ سے ۳۵ تک تمام عبارت صاف اڑا گیا ہے جس سے اس کی کتاب کے تمام دلائل درہم برہم ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسیحی لوگ مسیح کو خُدا کا بیٹا کہتے ہیں پر حضرت محمد نے ان کے ساتھ کوئی مناسب سلوک نہ کیا بلکہ کہا کہ قاتلھم اللہ اور آپ نے کلمات غضب آیات اپنی آخری عمر میں کہے جب آپکی رسالت اور کارگذاری کا انجام نزدیک تھا اور ضرور آپ نے یہ الفاظ سوچ سمجھ کر اور دل میں فیصلہ کر کے کہے ہونگے۔ ایک حدیث میں واقدی سے روایت ہے کہ آنحضرت اپنے بستر مرگ پر یوں کہتے تھے کہ خُدا یہود ونصاریٰ کو ہلاک کرے لیکن اس بات پر زور دینے کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ یہ حدیث ہی کچھ بہت اعتبار کے قابل نہ ہو جیسا کہ بیان ہو چکا ہے آنحضرت جابرانہ عداوت ودشمنی کے اظہار کے لئے جو آپ نے اپنے ہر ایک مخالف سے رکھتے تھے آخری ایام کا وحی قرآنی ہی کافی ہے دیکھو Muir's Life of Muhammad جلد چہارم صفحہ ۲۷۰۔

[169] ان تمام سخت ونرم آیات کے نزول کا وقت دریافت کرنا نہایت ضروری ہے۔ صرف تمام نرمی ملائمیت کی آیات جمع کرنا اور ان کے نزول کے محل اور متعلقہ واقعات کا بیان نہ کرنا جیسا کہ بعض اوقات ظہور میں آیا ہے۔ محض مغالطہ میں ڈالتا ہے۔ مثلاً Arnold's Preaching of Islam تیسرے سے چھٹے صفحہ تک ملاحظہ کیجئے

[170] دیکھو Osberni's faith of Islam صفحہ ۵۴

زیادہ سر گرم مسلمانوں کی بڑی خواہش تھی۔ کہ سیریا (شام) کے عیسائیوں اور مخالف عربی اقوام کے بر خلاف لڑائی میں شریک ہوں۔ لیکن ان سب کے لئے سواری اور دیگر مصارف جنگ کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے جنگی ضروریات کے بہم نہ پہنچنے کے باعث وہ جنگ میں شریک ہونے سے قاصر رہے۔ لہذا جنہوں نے دیکھا کہ ان کی خدمات کار آمد یا مفید نہیں ہو سکتیں زار زار رونے لگے۔ چنانچہ اس وقت سے ان کا نام البا کیون یعنی رونے والے مقرر ہو گیا۔ ان کے حق میں ایک آیت نازل ہوئی اور انہیں بتلایا گیا کہ ان کا کچھ قصور نہیں ہے چنانچہ سورہ توبہ کے رکوع ۱۲ میں یوں مرقوم ہے۔ **وَلاَ عَلَى الَّذِينَ إِذَا مَا أَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لاَ أَجِدُ مَا أَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّواْ وَّأَعْيُنُهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا أَلاَّ يَجِدُواْ مَا يُنفِقُونَ** یعنی اور نہ ان پر کہ جب تیرے پاس آئے تاان کو سواری دے۔ تونے کہا نہیں پاتا ہوں وہ چیز کہ اس پر تم کو سوار کروں الٹے پھرے اور ان کی آنکھوں سے بہتے ہیں آنسو غم سے کہ نہیں پاتے جو خرچ کریں۔

مدینہ کے چند منافقین نے آنحضرت کی مہمات (لڑائیاں) اور تسخیرات (فتوحات۔ قابو میں لانا)[171] میں آپکا ساتھ نہیں دیا تھا۔ جب آپ مدینہ میں واپس تشریف لائے تو آپ نے ان کو خوب دھمکایا۔ ان منافقین اور بدوی لوگوں کی سرزنش اور دیگر خاص وعام اشخاص کی آگاہی کے لئے خاص آیات نازل ہوئیں۔ چنانچہ سورہ توبہ کی ۳۸، ۳۹ و ۸۲ اور ۸۷ آیات میں یوں مندرج ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُواْ فِي سَبِيلِ اللّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الأَرْضِ أَرَضِيتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الآخِرَةِ إِلاَّ تَنفِرُواْ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلاَ تَضُرُّوهُ شَيْئًا وَاللّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلاَفَ رَسُولِ اللّهِ وَكَرِهُواْ أَن يُجَاهِدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَقَالُواْ لاَ تَنفِرُواْ فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا لَّوْ كَانُواْ يَفْقَهُونَ فَلْيَضْحَكُواْ قَلِيلاً وَلْيَبْكُواْ كَثِيرًا جَزَاء بِمَا كَانُواْ يَكْسِبُونَ فَإِذَا رَجَعَكَ اللّهُ إِلَى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَأْذَنُوكَ لِلْخُرُوجِ فَقُل لَّن تَخْرُجُواْ مَعِيَ أَبَدًا وَلَن تُقَاتِلُواْ مَعِيَ عَدُوًّا إِنَّكُمْ رَضِيتُم بِالْقُعُودِ أَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُواْ مَعَ الْخَالِفِينَ وَلاَ تُصَلِّ عَلَى أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلاَ تَقُمْ عَلَى قَبْرِهِ إِنَّهُمْ كَفَرُواْ بِاللّهِ وَرَسُولِهِ وَمَاتُواْ وَهُمْ فَاسِقُونَ وَلاَ تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلاَدُهُمْ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّهُ أَن يُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ وَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُواْ بِاللّهِ وَجَاهِدُواْ مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُوْلُواْ الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُواْ ذَرْنَا نَكُن مَّعَ الْقَاعِدِينَ**[172] یعنی اے ایمان والو کیا ہوا ہے تم کو جب کہئے کوچ کرو اللہ کی راہ میں ڈھے جاتے ہو زمین پر۔ کیا ریجے دنیا کی زندگی پر آخرت چھوڑ کر۔ اگر نہ نکلو گے تم کو دیگا دکھ کی مار خوش ہوئے پچھاڑی والے بیٹھ رہ کر جدا رسول اللہ سے اور بُرا لگا اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں اور بولے مت کوچ کرو گرمی میں۔ تو کہہ دوزخ کی آگ اور سخت گرم ہے اگر ان کو سمجھ ہوتی۔ اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورۃ کہ یقین لاؤ اللہ پر اور لڑائی کرو اسکے رسول کے ساتھ ہو کر۔ رخصت مانگتے ہیں ان کے مقدور والے اور کہتے ہیں ہم کو چھوڑ دے رہ جاویں ساتھ بیٹھنے والوں کے پھر ۹۱ آیت میں بدوی لوگوں کو آنحضرت نے یوں دھمکایا۔ **وَجَاء الْمُعَذِّرُونَ مِنَ الأَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِينَ كَذَبُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ سَيُصِيبُ الَّذِينَ كَفَرُواْ مِنْهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ**۔ یعنی اور آئے بہانے کرتے گنوار تا رخصت ملے ان کو اور بیٹھ رہے جو جھوٹے ہوئے اللہ سے اور رسول سے اب پہنچیگی ان کو ان میں جو منکر ہوئے دکھ کی مار۔

اس طرح سے ان سب کو جو گھروں میں بیٹھے رہے اور لڑائی میں شریک نہ ہوئے زجر و توبیخ (لعنت ملامت) کی گئی اور آنحضرت کو اپنے تمام مومنین سمیت جو آپ کے ساتھ گئے بہت تحسین و آفرین (تعریف) نصیب ہوئی۔ اور یہ خوشخبری ملی کہ تمام اچھی چیزیں آپکی خاطر تیار و مہیا بلکہ آپکی منتظر ہیں۔ کیونکہ خُدا تعالیٰ نے آپکی خاطر باغ لگا کر ان میں نہریں جاری کی ہیں۔ اور وہاں آپ اور آپ کے مومنین سدا خوشحال

---

[171] آنحضرت نے اپنی مدنی رہائش کے ایام میں عرصہ دس سال کے اندر اندر ۳۸ مرتبہ لشکر کشی اور ان حملوں میں سے ۲۷ میں آپ نے بذات خود اشاعت اسلام کی خاطر سپہ سالاری کی۔ دیکھو کیلی صاحب کی کتاب Muhammad and Muhammadanism کے صفحہ ۲۳۳ پر ابن اسحاق اور ابن ہشام کے مقتبسات۔

[172] ۸۲ آیت سے ۱۰۷ آیت تک ساری عبارت اسی مضمون کے متعلق ہے لیکن ہم نے صرف چند آیات اقتباس کی ہیں۔

[173]وفرخندوفال(مبارک شگون)رہینگے۔ بعض مسلمانوں نے بعد اپنے قصور کا اقرار کر کے معافی حاصل کی لیکن آنحضرت کو اشارہ ہوا کہ انکا تمام مال واسباب لے لیویں تاکہ وہ پاک وصاف ہوں۔ان کے علاوہ اور بھی تھے جو کہ جب تک ان کے حق میں کوئی خاطر خواہ فیصلہ نہ ہوا منتظر رہے۔لیکن آخر کار انہوں نے بھی معافی[174] حاصل کی۔

سورہ توبہ سب سے آخری ہے یا کم از کم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے بعد صرف ایک ہی سورۃ نازل ہوئی تھی[175]۔یہ سورۃ نہایت سخت ہے اور اس کے احکام برداشت سے باہر ہیں۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت کا مزاج بجائے نرمی وملائمیت اختیار کرنیکے سال بسال اور بھی سخت ودرشت ہوتا گیا۔اور آپ کی جنگی روح کو ہمیشہ معرکہ آرائی کے مضامین کے لئے مفروضہ الہیٰ ارشاد کی منتظر کمال تک پہنچ گئی۔چنانچہ سورہ توبہ کے ۱۰ رکوع کی پہلی آیت میں اسی مضمون پر یوں مندرج ہے۔[176] **يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ**۔اے نبی لڑائی کر کافروں سے اور منافقوں سے اور تند خوائی کر ان پر اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور بری جگہ پہنچے۔

سب سے آخری حملہ جس میں آنحضرت بذات خود سپہ سالار تھے جنگ تبوک تھا۔اور اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ تمام مخالفت اور ہر طرح کے خوف وخطر کا خاتمہ ہوا۔ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کے مومنین نے اسلحہ جنگ فروخت کرنے شروع کر دئے اور کہنے لگے اب جہاد کی کچھ ضرورت نہیں۔

جب آنحضرت نے یہ خبر سنی تو ان کو ہتھیار بیچنے سے منع کیا اور فرمایا کہ جب تک[177] دجال ظاہر نہ ہو میرے مومنین اشاعت حق کے لئے ہمیشہ لڑائی میں مصروف رہینگے۔خواہ یہ حدیث معتبر ہو یا غیر معتبر۔کم از کم اس سے یہ بات بخوبی معلوم ہو جاتی ہے کہ اس وقت جہاد کی نسبت مومنین کا کیا خیال تھا۔علاوہ ازیں یہ حدیث اس دوسری حدیث **الجهاد ماضی الی یومه القیامة** کے مطابق ہے۔

سالانہ حج کے معمولی وقت پر حضرت محمد مکہ میں تشریف فرمانہ ہوئے۔کیونکہ ابھی بہت سے لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔اسلئے ۹ ہجری میں آپ نے حضرت ابو بکر کو حاجیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ روانہ کیا۔مگر اس حالت میں رہنا آپ کو کب پسند تھا۔فوراً پیغام آیا کہ عرب کے گنواروں(بدزیب۔بدنماؤں)کی عزت وحرمت کی آنحضرت کو کچھ پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔چنانچہ اس آسمانی حکم کے اشتہار کی خاطر ابو بکر اور دیگر حاجیوں کی روانگی کے بعد حضرت علی روانہ ہوئے۔اور مکہ میں ان سے جاملے۔رسوم حج کے اختتام پر حضرت علی نے وحی کا وہ سارا بیان جو حضرت محمد نے

---

[173] دیکھو سورہ توبہ ۹۰ آیت۔

[174] سورہ توبہ کی ۱۰۳ آیت سے ۱۰۵ آیت تک اور ۱۱۸ و ۱۱۹ آیت۔

[175] اس سورۃ کا بہت سا حصّہ ۹ ہجری سے علاقہ رکھتا ہے اگرچہ ۳۱ سے ۱۶ آیت تک اس سے پہلے سال کا حال پایا جاتا ہے ۳۶ آیت ۷ ۳ دس ہجری سے متعلق ہیں۔باقی آیات کسی تواریخی ترتیب میں مرتب نہیں کی گئیں لیکن مجموعی طور پر اس سورۃ سے پتہ لگتا ہے کہ ۹ سے ۱۰ ہجری میں جو کہ آنحضرت کی ترقی کا زمانہ تھا آپ کے دل کی کیا حالت تھی اور خصوصاً آنحضرت کا بے حد تکبر وغضب جو اس سے سورۃ سے ظاہر ہوتا ہے قابل غور ہے(دیکھو نولدیکی صاحب کا گشختی دس قرآن صفحہ ۱۶۵ سے ۱۶۹ تک)۔

[176] نولدیکی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب حضرت محمد تبوک سے واپس آئے تھے ۹ ہجری کے آخری میں۔دیکھو گشختی دس قرآن صفحہ ۱۶۷۔

[177] Muir's Life of Muhammad جلد چہارم صفحہ ۲۰۳ پر مقتبسات واقدی

ان کے سپرد کیا تھا۔ حاجیوں کے انبوہ کثیر کو پڑھ کر[178] سنایا۔ چنانچہ سورہ توبہ کی پہلی پانچ آیت میں یوں مندرج ہے **بَرَاءةٌ مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَفَسِيحُواْ فِي الأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَاعْلَمُواْ أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّهِ وَأَنَّ اللّهَ مُخْزِي**[179] **الْكَافِرِينَوَأَذَانٌ مِّنَ اللّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى النَّاسِ يَوْمَ**[180] **الْحَجِّ الأَكْبَرِ أَنَّ**[181] **اللّهَ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ فَإِن تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَإِن تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُواْ أَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّهِ وَبَشِّرِ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍإِلاَّ الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُواْ عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّواْ إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَفَإِذَا انسَلَخَ الأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُواْالْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ** یعنی جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول سے ان مشرکوں کو جن سے تم کو عہد تھا۔ سو پھر اس ملک میں چار مہینے اور جان لو کہ تم نہ تھکا سکو گے اللہ کو اور یہ کہ اللہ رسوا کرتا ہے منکروں کو۔ اور سنا دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اسکے رسول سے لوگوں کو بڑے حج کے دن کہ اللہ الگ ہے مشرکوں سے اور اس کا رسول۔ سو اگر تم توبہ کرو تمہارے لئے بھلا ہے اور اگر نہ مانو تو جان لو کہ تم نہ تھکا سکو گے اللہ کو۔ اور خوشخبری دے منکروں کو دکھ والی مار کی۔ مگر جن مشرکوں سے تم کو عہد تھا پھر کچھ قصور نہ کیا تمہارے ساتھ اور مدد نہ کی تمہارے مقابلہ میں کسی کی سو پورے کرو ان سے عہد ان کے وعدہ تک۔ اللہ کو خوش آتے ہیں احتیاط والے پھر جب گذر جاویں مہینے پناہ تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ۔

پہلی اور چوتھی آیت میں تناقض (مخالف ہونا) نظر آتا ہے۔ کیونکہ پہلی آیت کی رو سے حضرت محمد ایفائے عہد (عہدِ وفا) سے بالکل آزاد اور بری ہو جاتے ہیں۔ اور چوتھی آیت میں مشرکین کے ساتھ آنحضرت کے دوستانہ عہد و پیمان کا ذکر پایا جاتا ہے۔ اور غالباً اس کا بیان یوں کیا جاتا ہو گا۔ کہ مشرکین کی حیثیت میں ان کو حج کعبہ کی تو اجازت ہی نہ تھی۔ اس لئے ان کے ساتھ جو عہد و پیمان تھا۔ اس کی دیگر شرائط کا ایفا (وفا کرنا) ضروری تھا ۔ جن صاحبوں نے تاحال اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ انہوں نے حضرت علی کی ساری تقریر کو بغور سنا۔ اس تقریر میں یہ آیت بھی شامل تھی۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلاَ يَقْرَبُواْ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَـذَا**۔ یعنی اے ایمان والو مشرک جو ہیں پلید ہیں سو نزدیک نہ آویں مسجد الحرام کے اس برس کے بعد (سورہ توبہ ۲۸ آیت)۔

یہ حکم ایسا صریح اور صاف تھا اور اس کی عملی طور پر اس قدر تائید کی گئی۔ کہ باشندگان عرب کو سوائے تابعداری کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی چنانچہ انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔

اب تمام مخالفت رفع دفع ہو گئی۔ اور کعبہ سے بُت پرستی کے تمام تعلقات منقطع کئے گئے۔ مسلمانوں کے سوا کسی کو کعبہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ رہی۔ لہذا آنحضرت نے بڑے حج پر خود بدولت تشریف لیجانیکا مصمم ارادہ (مضبوط ارادہ) کر لیا۔ کہتے ہیں کہ ۱۰ ہجری میں اس حج کے وقت ایک لاکھ سے زیادہ آدمی آپ کے ہمرکاب (ہم سفر) تھے۔ آنحضرت نے نہایت احتیاط کے ساتھ تمام رسوم حج کو یکے بعد دیگرے پورا کیا۔ حجرِ اسود کو

---

[178] کہتے ہیں کہ حضرت علی نے ان کے سامنے اس امر کی بخوبی توضیح کر دی کہ مومنین و کافرین اور بُت پرستوں اور واحد خُدا کے پرستاروں کے درمیان کسی طرح کے عہد و پیمان اور صلح و امن کا امکان نہیں۔ اور سوائے مسلمانوں کے بہشت میں اور کوئی نہیں ہو گا یعنی صرف مسلمان ہی بہشت میں جائینگے۔ دیکھو خلاصۃ التفاسیر جلد دوم صفحہ ۲۱۵۔

[179] لفظی ترجمہ یہ ہے کہ خُدا کو کمزور نہیں کر سکتے یعنی اس کو اپنے اس ارادہ کے پورا کرنے سے روک نہیں سکتے۔

[180] یعنی حج نہ کہ عمرہ یا حج اصغر۔

[181] **واللہ بَرِيءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ** کا ترجمہ مفسر حسین نے یو کیا ہے کہ خُدا بیزار است از مشرکین و عہد و ایشاں و پیغمبر نیز بیزار است۔ دیکھو تفسیر حسینی جلد اوّل صفحہ ۲۴۷۔

چوما زمزم سے پانی پیا اور اہلِ عرب کی دیگر پرانی رسومات[182] کو بھی آپ نے ادا کیا۔ اس موقعہ کو آپ نے غنیمت جانا اور توارث (وراثت) وزنا (بدکاری) کے متعلق ایک تقریر[183] کی۔ اور یہ فیصلہ کیا کہ زانیہ (زناکار عورت) کو کوڑوں سے ماریں پر بہت سختی سے نہ ماریں۔ نیز آپ نے اس تقریر میں غلاموں کی بابت اور مسلمانوں کے باہمی مساوی درجات کی نسبت تعلیم دی۔ قمری سال کو سالِ شمسی کی طرف تحویل کرنیکے لئے جو تین سال کے عرصہ میں ایک مہینہ زیادہ کیا جاتا تھا آپ نے سورہ توبہ کی ۳۶ اور ۳۷ آیت سنا کر اس کو بھی موقوف کیا اور قمری سال کے متبدل موسموں کے مطابق ماہ ذی الحج مقرر فرمایا۔

انہی دنوں میں ایک دن آپ کوہ ارافات کی چوٹی پر تشریف لیگئے اور اونٹ پر سیدھے کھڑے ہو کر فرمایا[184] **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دیناً**۔ یعنی آج میں پورا دے چکا دین تمہارا اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے دین مسلمانی۔

اس طرح اس بُت پرستی کی رسم کی شمولیت سے وہ مذہب جسکو آنحضرت اپنے ہم وطنوں کے لئے قائم کر گئے۔ اور جس سے پہلے تمام ادیان کی تنسیخ (منسوخ کرنا) متصور (تصور) ہونے لگی۔ کاملیت کے درجہ تک پہنچ گیا۔ سورہ حج کی ۲۸ و ۳۰ و ۳۴ آیت میں فرائض حج کا بیان یوں مندرج ہے۔ کہ **وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ**۔ یعنی اور پکار دے لوگوں میں حج کے واسطے۔ پھر چاہئے نہیڑیں[185] اپنا میل کچیل اور پوری کریں اپنی منتیں اور طواف کریں قدیم گھر کا۔ تم کو چارپایوں میں فائدے ہیں ایک ٹھہرائے وعدہ تک پھر ان کو پہنچانا اس قدیم گھر تک۔

سورہ حج کو خالص مکی یا مدنی نہیں کہہ سکتے۔ اس کا کچھ حصّہ مکہ میں نازل ہوا تھا اور کچھ مدینہ میں جن آیات کو ہم نے ابھی اقتباس کیا ہے ان کے وقت نزول کا ٹھیک پتہ لگانا آسان نہیں ہے۔ لیکن اغلباً یہ آیات مدنی ہیں اور ۶ ہجری میں حج صغرا کے موقعہ پر نازل ہوئی تھیں۔ بہر کیف (بہر حال) یہ احکام آنحضرت نے پہلے ہی نافذ کئے ہوئے تھے۔

اور اب خود ان پر کاربند ہو کر آپ نے ان کو جواز (اجازت) پر مہر کی اور اس وقت سے حج کعبہ ہر مسلمان کے دینی فرائض میں داخل ہو گیا۔ ان ایام میں حج کرنا بلاشبہ ایک ملکی کارروائی تھی۔ کیونکہ یہ قومی معبد مرکز اسلام اور اس کے جان نثاروں کے سالانہ اجتماع کا مقام ہونے کی حیثیت میں اس عزت و حرمت کو حاصل کر کے تمام باشندگان عرب اور خاص کر قریش کے لوگوں کے خیالات کو جو کہ خاص شہر مکہ ہی میں سکونت پذیر تھے کھینچ رہا تھا۔

---

[182] ایک حدیث میں یوں مذکور ہے کہ آنحضرت نے فرمایا کہ رسومات حج کو پورا کرو اور مجھ سے سیکھو کہ تمہیں انکو کس طرح ادا کرنا چاہئے کیونکہ میں نہیں جانتا کہ اس کے بعد پھر مجھ کو حج کرنا نصیب ہو گا یا نہیں۔ دیکھو Muir's Life of Muhammad کے صفحہ ۲۳۴ پر حوالہ جات واقدی۔

[183] آنحضرت کی یہ تقریر Muir's Life of Muhammad کی چوتھی جلد میں ۲۳۸ سے ۲۴۲ تک مندرج ہے۔

[184] عبداللہ ابن عباس اس آیت کا مطلب یوں بیان فرماتے ہیں کہ میں نے تم کو حلال و حرام اور اوامر نواہی کے سب احکام بتادئے ہیں آج کے دن سے لے کر کبھی کوئی مشرک ارافات و منا تک نہ پہنچے پاوے اور نہ کعبہ کا طواف کرے اور نہ صفا و مروہ کے درمیان دوڑے دیکھو تفسیر ابن عباس صفحہ ۱۲۱۔ پھر تفسیر حسینی جلد اوّل بقیہ حاشیہ ۱۳۷ صفحہ پر یوں مرقوم ہے کہ امروز کامل گردانیدم برائے شما دین شما را کہ دیگر احکام اور ناقص نخواہد بود تمام کردم بر شما نعمت خود را کہ حج گذاریدا یمن و مطمئن باشید و ہیچ مشرک باشما حج نگذارد و اختیار کردم برائے شما اسلام را دینے کہ پاکیزہ تراز ہمہ دینہا۔ خلاصہ التفاسیر جلد اوّل کے ۴۸۸ صفحہ پر تمام مفسرین کے بیان کا خلاصہ اور لب لباب یوں مندرج ہے کہ ہمارے دین میں از روئے دلائل والہام کسی طرح سے کوئی نہیں کسی نئے مسئلے کی ضرورت نہیں اور کسی طرح کی ترقی و تنسیخ کی گنجائش نہیں ہے۔

[185] یعنی ناسترده جھاڑ داڑھی اور ننگا سر Sell's Faith of Islam صفحہ ۹۱۔

صرف حج کعبہ ہی ایک ایسی رسم تھی۔ جس میں وہ سب لوگ مسلمانوں کے ساتھ شریک تھے۔ اور اس کے جاری رہنے سے خوش ہو کر رفتہ رفتہ وہ اسلام کے نزدیک ہوتے گئے۔ آنحضرت کا حج کی پرانی[186] رسومات کو قائم رکھنا بھی آپکی دانائی اور ہوشیاری کی دلیل (گواہی) ہے۔ اہلِ عرب کی نظر میں کعبہ اور اسکے متعلقات کی بالعموم (عام طور) بہت ہی عزت و تعظیم ہوتی تھی۔ حج کا یہ ایک بڑا بھاری مقصد تھا کہ عرب کی مختلف قومیں جن کے درمیان مدتوں سے بغض و حسد کا راج قائم تھا۔ ایک دل اور ایک جان ہو جاویں اور ایک نہایت اعلیٰ و خاص مطلب کے لئے زبردست جماعت مجتمع (جمع ہونا) ہو جاوے لیکن فی الحقیقت یہ نہایت کمزوری اور بوداپن کی دلیل تھی کیونکہ اس سے یہ حقیقت بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام ایک قومی مذہب تھا اور اس کا آغاز اور تکمیل اس امر کے شاہد (گواہ) ہیں۔ اس کے احکام و قواعد جو کہ ساتویں صدی میں اہلِ عرب کی ضروریات کے مطابق تھے۔ نویں صدی کے لوگوں کے لئے ان پر کاربند ہونا از حد دشوار و مشکل تھا۔ اور یہ اسلام کی ترقی کا سخت مانع ہے۔ اس عقیدہ کی عمارت کے محراب کا سرا ایک کالا پتھر ہے جو پہلے ایک بُت خانہ میں تھا۔ اس طرف جانا اور بُت پرستوں کی پرانی رسوم کو ادا کرنا نجات[187] کا سچا طریق بیان کیا جاتا ہے۔ اہل اسلام کی عقلیں اور ان کے دل گویا اس کالے پتھر سے بیابان میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور اسی قسم کی چیزوں کی عزت و تعظیم کرتے ہیں۔ نور ہدایت کے تازگی بخش قطرات ان کو تروتازہ ۲* [188] کرنے کے لئے بالکل بے اثر اور بیفائدہ معلوم ہوتے ہیں۔

اس میں ذرا شک نہیں کہ اسلام میں ہر طرح کی بہتری اور اصلاح کا روکنے والا حج ہی ہے۔ اور اسلام میں اصلاح تو ہی ہو سکتی ہے جبکہ اہلِ اسلام اصلاح کی خواہش کو ظاہر کریں پر حج کی دوامی قید سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ اصلاح کے خواہاں نہیں ہیں[189] بلکہ بر خلاف اس کے یہ ماننا پڑتا ہے کہ حج کی مداومت (قیام) سے مسلمان متعصب (مذہب کی بے جا حمایت کرنے والے) اور دن بدن اپنے عقائد پر زیادہ پختہ ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں مسلمان جو کہ گذشتہ صدیوں میں گذر چکے ہیں باوجود مختلف زبانوں اور نسلوں سے علاقہ (تعلق) رکھنے کے آپس میں کسی قدر برادرانہ اتحاد اور یگانگت رکھتے تھے۔ علاوہ اسکے حج کے وسیلہ سے حضرت محمد کی ایک نہایت عمدہ یادگار قائم ہو گئی۔ مکہ مسلمانوں کی نظر میں ایسا ہی تعظیم و تکریم کے لائق ہے۔ جیسا کہ یروشلم یہودیوں کی نظر میں۔ گذشتہ صدیوں کے لوگوں کی عزت و تعظیم کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس کے خیال سے ہر ایک مسلمان اپنے ایمان کے آغاز اور اپنے نبی کے ایامِ طفولیت (بچپن کے دن) کو یاد کرتا ہے۔ نیز مکہ کے خیال سے خواہ مخواہ یہ بات یاد آتی ہے کہ پرانے مذہب اور نئے دین میں کس طرح کشمکش ہوتی رہی۔ اور بُت پرستی کو نیست و نابود اور بُتوں کو چکنا چور کر کے واحد خُدا کی عبادت قائم کی گئی۔

سب سے بڑھ کر ہر ایک مسلمان کو یہ جتلاتا ہے کہ اس کے تمام مسلمان بھائی ایک ہی جگہ اور ایک ہی مقدس مقام کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور یہ کہ مومنین کی ایک بھاری جماعت میں وہ بھی شامل ہے جو کہ ان کے ساتھ ایمان و اُمید میں شریک ہو کر ان ہی چیزوں کی عزت و تعظیم کرتا ہے جس کی وہ کرتے ہیں۔ اور اسی خُدا کی عبادت میں کھڑا ہوتا ہے جس کو وہ پوجتے ہیں۔ حضرت محمد نے جب کعبہ کی تقدیس (پاک کرنا) کی تو اس امر

---

186 تمام اہل عرب میں جو کعبہ کی عزت و تعظیم تھی وہ بھی اس امر میں آنحضرت کی مدد کا ایک نہایت عمدہ وسیلہ تھی کہ آپ تمام عربی اقوام کو ایک خاص مقصد کو مد نظر رکھ کر اکٹھا کریں۔ اب آنحضرت کو ایک مزار ہاتھ آیا جس کی نہایت خصوصیت کے ساتھ صدہا سال سے عزت و حرمت ہوتی چلی آتی تھی اور مقدس مقام کی تعظیم و تکریم کے باب میں تمام عرب جو ملک کے مختلف حصوں میں آباد تھے شراکت رکھتے تھے اور یہی مقام تھا جس سے کبھی ان کے دلوں میں قومی پاسداری کا خیال آسکتا تھا اور آنحضرت کے لئے اس کی تردید کرنا اور اسکی عزت و تعظیم کے بر خلاف تعلیم دینا ایک طرح کی دیوانگی متصور ہوتا اور اس سے آپکی ساری مہمات کا مطلب فوت ہو جاتا۔ دیکھو پامر صاحب کا قرآن صفحہ ۵۳۔

187 دیکھو Sell's Faith of Islam صفحہ ۲۸۸۔

188 Osbern's Islam under the Arabs صفحہ ۸۳

189 حج فرض ہے اور فرض کی تعریف کے لئے Sell's Faith of Islam کا ۲۸۸ صفحہ اور ۲۵۱ صفحہ ملاحظہ فرمایئے۔ مولوی رفیع الدین احمد صاحب نے مطبوعہ اکتوبر ۱۸۹۷ء میں یوں فرمایا کہ حج انسان کے دل کو پاک صاف کرتا ہے اور ایسا بے گناہ اور معصوم بنا دیتا ہے جیسا کہ پیدائش کے وقت معصوم بچوں کا حال ہوتا ہے۔

کو ظاہر کیا کہ آپ کو انسان کے مذہبی جذبات کا کہاں تک علم تھا لہذا ایک طرح سے حج کا قائم رکھنا اسلام کی پائیداری کا باعث معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جس قدر اس پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اسی قدر اصلاح کرنا نہ صرف بُت پرستوں کی خواہشات کے مقابلہ میں کمزوری کا نشان تھا۔ بلکہ اس سے عقل وانصاف کا بھی خون ہو گیا۔

اس بیان سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ قرآن میں جس قدر تواریخی واقعات کا ذکر پایا جاتا ہے وہ سب سچ ہیں لیکن اور بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا ہم نے مطلق (بالکل) ذکر نہیں کیا مثلاً مکی معاملات یعنی عہد وپیمان وغیرہ کا قائم کرنا۔ منافقین سے برتاؤ اور متحدہ اقوام سے سلوک کرنے کا بیان بھی قرآن میں مندرج ہے۔ پھر انتظامی معاملات مثلاً نکاح، طلاق، توارث (وراثت)، شہادت اور وصیت وغیرہ کے قانون بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک ایسا رجسٹر ہے جس میں ملک وملت کی امتزاجی سلطنت کے آئین وقوانین مرقوم ہیں۔ یہ متذکرہ بالا امور زیادہ تر مدنی سورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ سوائے بقر، نساء اور مائدہ جو کہ قریباً طوالت میں برابر اور کل قرآن کا ساتواں حصّہ ہیں ان میں دینی اور ملکی فرائض اور قوانین فوجداری مفصل طور سے مندرج ہیں۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ وہ شخص جو کہ مکہ میں محض واعظ اور نصیحت گو تھا۔ مدینہ میں واضع قوانین اور جنگی سپہ سالار بن گیا۔ اور بجائے اس کے کہ ایک شاعر اور معلم کی حیثیت میں قلم کا استعمال کرے لوگوں کو مطیع ومنقاد (طابع وفرمانبردار) بنانے کے لئے تیغ براں (کاٹنے والی تلوار) ہاتھ میں لئے ہوئے حرب وضرب (لڑائی جنگ) کا نعرہ بلند کرنے لگا۔ جب مدینہ میں کارگزاری بڑھ گئی۔ تو نظم کی جگہ نثر کا استعمال ہونے لگا اگرچہ اس میں بھی شاعرانہ خیالات معلوم ہوتے تھے۔ تاہم بعض اوقات بالکل نثر رہ جاتی تھی۔ اور آنحضرت کو یہاں سے شروع کرکے اپنے آپ کو محض[190] شاعر کے الزام سے بری کرنے کے لئے مدت تک کوشش کرنی پڑی پر مدنی سورتوں میں یہ بہت ہی کم نظر آتا ہے۔ جب ہم اس قسم کے فقرات کی اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی۔ اللہ اور اس کے رسول کا انعام اور اللہ کی اور اسکے رسول خوشنودی وغیرہ کو قرآن میں پڑھتے ہیں تو نہایت حیرت زدہ ہوتے ہیں کہ آنحضرت کس قدر ان اوصاف کو جو قرآن کے اور مقامات میں خُدا کے لئے مخصوص ہیں اپنی طرف منسوب (جوڑنا) کرتے ہیں۔

مدنی سورتوں میں یہ جملہ کہ اللہ اور اس کا رسول بہت عام ہے اور انہی سے مخصوص[191]۔ اب آنحضرت نے ایک واعظ (نصیحت کرنے والا) اور متنبہ کنندہ (خبردار کرنے والا) کی حیثیت سے گذر کر فرمانروا اور خُدا کی سلطنت کے کار مختار کی حیثیت کو اختیار کیا۔ اور اب آپ کے احساس کا مضمون پہلے کی نسبت بالکل مختلف اور الہیٰ اختیار دکھاتا تھا۔ کفارہ کا ذکر کرتے وقت آپ فرماتے تھے۔ کہ کافر وہ ہیں جو ایمان نہیں لاتے اور خُدا کے الہام ووحی کو نہیں مانتے۔ لیکن مومنین کو آپ نے یوں فرمایا۔ امنو باالله ورسوله النور الذی انزلنا یعنی ایمان لاؤ اللہ پر اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے اتارا۔ پھر خُدا اور رسول کی مخالفت کا ذکر بھی اکٹھا ہی آتا ہے۔ گویا کہ دونوں کے لئے یکساں سزا مقرر ہے۔ چنانچہ سورہ انفال کی ۱۳ آیت میں یوں مرقوم

---

190 دیکھو سورہ النفال ۳۱ آیت۔

191 صرف ایک مقام اس سے مستثنیٰ ہے کیونکہ سورہ اعراف کی ۱۵۸ آیت میں یہ فقرہ درج ہے سورہ اعراف ایک مکی سورۃ ہے لیکن ۱۵۶ سے ۱۵۸ تک آخری دنوں کے الہامات کی آیات درج کی ہوئی ہیں ان میں جو جملہ النبی لامی پایا جاتا ہے کہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات مدنی ہیں کیونکہ یہ ایک ایسا محاورہ ہے جو صرف مدنی آیات سے مخصوص ہے۔ ان آیات میں انجیل وتوریت کی طرف جو اشارہ کیا جاتا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ آیت آخری ایام یعنی ایام مدینہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ پھر ان لوگوں کی طرف بھی ایک اشارہ ہے جو تقویت ومدد کرتے ہیں چنانچہ لکھا ہے غرور ونصرہ یہ صاف انصار کی طرف اشارہ ہے کیونکہ اس کا ترجمہ مفسر حسین یوں کرتے ہیں کہ یاری دادند اور برادشمنان۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ بالسیف یعنی انہوں نے مدد کی اس کی تلوار پکڑ کر۔ پس اس سے صاف فیصلہ ہو جاتا ہے کہ یہ آیات آخری یعنی ایام مدینہ میں نازل ہوئی تھیں اللہ ورسولہ یعنی اللہ اور اسکا رسول ایک فقرہ ہے جو ماقبل اور مابعد کی آیتوں سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے اور نہایت صفائی سے ظاہر کرتا ہے یہ آیت آخری زمانہ کی یعنی مدنی ہیں

Noldeke's Geschichte des Quran's p ۱۱۸

ہے۔**وَمَن يُشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ**۔یعنی اور جو کوئی مخالف ہو اللہ کا اور اسکے رسول کا تو اللہ اسے سخت سزا دیتا ہے۔ پھر مومنین کو ایک اور ہی طرح زندگی اور روش کو اختیار کرنیکا فرمان ہوتا ہے۔

ختم شد